الرسالہ

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

کوئی کسی کا چراغ نہیں بجھاتا ——
چراغ کے اندر تیل کی کمی اسے بجھا دیتی ہے

اکتوبر ۱۹۸۶
شمارہ ۱۱۹

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

اللہ اکبر	40/-
تذکیر القرآن جلد اوّل	80/-
الاسلام	25/-
مذہب اور جدید چیلنج	25/-
ظہورِ اسلام	25/-
احیاءِ اسلام	20/-
پیغمبرِ انقلاب	30/-
سوشلزم اور اسلام	25/-
صراط مستقیم	25/-
اسلامی زندگی	20/-
اسلام اور عصر حاضر	20/-
دین کیا ہے	3/-
قرآن کا مطلوب انسان	6/-
تجدیدِ دین	4/-
اسلام دینِ فطرت	4/-
تعمیرِ ملت	4/-
تاریخ کا سبق	4/-
مذہب اور سائنس	6/-
عقلیاتِ اسلام	4/-
فسادات کا مسئلہ	2/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	2/-
تعارف اسلام	4/-
اسلام پندرھویں صدی میں	4/-
راہیں بند نہیں	4/-

ایمانی طاقت	4/-
اتحادِ ملت	4/-
سبق آموز واقعات	4/-
زلزلۂ قیامت	5/-
حقیقت کی تلاش	4/-
پیغمبر اسلام	4/-
حقیقتِ حج	4/-
آخری سفر	4/-
اسلامی دعوت	4/-
خدا اور انسان	4/-
حل یہاں ہے	6/-
سچا راستہ	2/-
دینی تعلیم	4/-
حیاتِ طیبہ	4/-
باغِ جنت	4/-
نارِ جہنم	4/-
تبلیغی تحریک	12/-
دین کی سیاسی تعبیر	10/-
عظمتِ قرآن	25/-

Muhammad: The Prophet of Revolution	50/-
The Way to Find God	4/-
The Teachings of Islam	5/-
The Good Life	5/-
The Garden of Paradise	5/-
The Fire of Hell	5/-
Muhammad: The Ideal Character	4/
Man Know Thyself	4/-

مکتبہ الرسالہ سی - ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اُردو، انگریزی میں شائع ہونے والا

الرسالہ

اسلامی مرکز کا ترجمان

شمارہ ۱۱۹ — اکتوبر ۱۹۸۶

فہرست

	صفحہ		صفحہ
یہ انسان	۲	ایمان کی آزمائش	۱۴
داعی کا معاملہ	۳	تلبیس	۱۵
اپنی دلیل آپ	۴	کم بولنا زیادہ سننا	۱۶
اسلامی رواداری	۵	معروف و منکر	۱۷
نگرانی میں	۶	احتساب	۱۸
نفسیات جرم	۷	جھوٹی شکایت	۱۹
آخرت کا سوال	۸	برا نام دینا	۲۱
خدا کے نام پر	۹	خواب پورا ہو گیا	۲۴
عین وقت پر	۱۰	ایک سفر	۲۷
سرکشی	۱۱	خبر نامہ اسلامی مرکز	۴۴
واقفیت ضروری	۱۲	تعمیر ملت	۴۷
ایمان و عمل	۱۳	ایجنسی الرسالہ	۴۸

یہ انسان

موجودہ زمانہ کا ہر آدمی انتہائی حد تک بینا ہے اور اسی کے ساتھ انتہائی حد تک نابینا بھی۔ آج کے انسان کا حال یہ ہے کہ وہ دوسرے شخص کی غلطیوں کو انتہائی باریکی کے ساتھ دیکھ لیتا ہے اور اپنی غلطیوں کو دیکھنے کے لیے وہ بالکل اندھا بنا ہوا ہے۔

آج کی دنیا میں جو چیز سب سے زیادہ عام ہے وہ احتساب غیر ہے اور جو چیز سب سے زیادہ کم ہوگئی ہے وہ احتساب خویش ہے۔ بظاہر کوئی مذہبی ہے اور کوئی غیر مذہبی۔ کوئی اسلام کا علم بردار ہے اور کوئی غیر اسلام کا علم بردار۔ مگر اس اعتبار سے لوگوں میں کوئی فرق نہیں کہ لوگوں کو دوسروں کی کوتاہیاں ضرورت سے زیادہ دکھائی دیتی ہیں۔ اور اپنی کوتاہی ان کو بقدر ضرورت بھی دکھائی نہیں دیتی۔

لوگ دوسروں کی غلطیوں کا تذکرہ کرنے میں کیوں اتنا زیادہ دلچسپی لیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دوسروں کی غلطیوں کا تذکرہ کرکے اپنی بڑائی کے جذبے کو تسکین ملتی ہے۔ اس طرح آدمی یہ جھوٹی تسلی حاصل کرتا ہے کہ دوسرے لوگ برے ہیں اور میں اچھا ہوں۔ دوسرے غلطیاں کرتے ہیں اور میں غلطیوں سے پاک ہوں۔

اس جھوٹی تسلی میں آدمی صرف اس لیے پڑا ہوا ہے کہ اس کو یہ معلوم نہیں کہ اصل مسئلہ دوسروں کا نہیں بلکہ خود اپنا ہے۔ بھوک جب آدمی کو تڑپاتی ہے تو وہ جان لیتا ہے کہ سارا مسئلہ اپنی ذات کا ہے۔ اسی طرح جب قیامت آئے گی اور تمام حقیقتیں کھل جائیں گی، اس وقت آدمی جان لے گا کہ سارا مسئلہ اپنی ذات کا تھا نہ کہ دوسروں کا۔

آج آدمی جہنم سے دور ہے اس لیے وہ دوسروں کے بارہ میں الفاظ کے دریا بکھیر رہا ہے۔ مگر قیامت میں جب وہ جہنم کے بھڑکتے ہوئے شعلوں کے سامنے کھڑا ہوگا تو وہ سب کچھ بھول جائے گا۔ اس وقت وہ صرف ایک مسئلہ کو جانتا ہوگا ——— اپنے گناہوں کو کس طرح مٹائے، اپنے آپ کو کس طرح جہنم سے محفوظ رکھے۔

عقل مند آدمی وہ ہے جو آنے والے کل کو آج دیکھ لے۔

داعی کا معاملہ

ایک فن کار اپنی ساری صلاحیت استعمال کر کے آرٹ کا ایک نمونہ تخلیق کرے اور ایک شخص اس کو لے کر آگ میں ڈال دے تو ایسا شخص فن کار کی نظر میں کتنا زیادہ مبغوض ہوگا۔ فن کار کی نظر میں اس کا وجود انتہائی حد تک قابل نفرت ہو جائے گا۔

ایک باغبان برسوں کی محنت سے پھول کا ایک درخت اگاتے۔ پھر لمبے انتظار کے بعد اس کی شاخ پر ایک حسین پھول کھلے۔ اس وقت اگر ایک شخص آئے اور اس پھول کو توڑ کر اسے مسل ڈالے تو اس باغبان کی نظر میں وہ سخت ترین مجرم ہوگا۔ باغبان چاہے گا کہ اس کو بھی وہ اسی طرح مسل ڈالے جس طرح اس نے اس کے حسین پھول کو مسلا ہے۔

خدا کے داعی کا معاملہ بھی یہی ہے۔ خدا کا داعی اگرچہ بظاہر ایک انسان ہوتا ہے۔ مگر وہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے کائنات کی سب سے قیمتی متاع ہے۔ زمین و آسمان بے شمار گردشیں کرتے ہیں تب قدرت کا وہ قیمتی آرٹ ظہور میں آتا ہے جس کو خدا کا داعی کہتے ہیں۔ سیکڑوں سال کے اندر بے شمار اسباب جمع ہوتے ہیں تب خدا کی زمین پر معنویت کا وہ پھول کھلتا ہے جس کا دوسرا نام خدا کا داعی ہے۔

ایسی حالت میں جو لوگ خدا کے داعی کے خلاف تخریب کاری کے منصوبے بنائیں وہ پوری کائنات کی ناقدری کرتے ہیں۔ وہ خدا کے خلاف سب سے زیادہ سنگین بغاوت کرتے ہیں۔ وہ اس پھول کو مسلنے کی کوشش کرتے ہیں جس کو خدا نے خود اگایا ہے۔

خدا کی ضمانت ہے کہ ایسے لوگ اپنے منصوبہ میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔ ان کے لیے ناممکن ہے کہ وہ خدا کے داعی کو اس کے مشن کی تکمیل سے باز رکھ سکیں۔ خدا کا سچا داعی خدا کی خاص حفاظت کے سایہ میں رہتا ہے۔ اس کے لیے خدا کا ابدی فیصلہ ہے کہ وہ لازمی طور پر کامیاب ہو، اور اس کے دشمن لازمی طور پر ناکام و نامراد ہو کر رہ جائیں۔

خدا کے داعی کو زیر کرنا ایسا ہی ہے جیسے خدا کو زیر کرنا، اور کون ہے جو خدا کو زیر کرنے کی طاقت رکھتا ہو (۱۷ جنوری ۱۹۸۶)

اپنی دلیل آپ

قرآن کے بہت سے حصے ایسے ہیں جو بظاہر صرف "بیان" معلوم ہوتے ہیں۔ یعنی ان بیانات کے ساتھ ان کی دلیل مذکور نہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ بیانات اپنی دلیل آپ ہیں۔ کیونکہ یہ الفاظ ماورار انسانیت ہیں۔ یہ صرف خدا ہے جو ان الفاظ میں کلام کرسکتا ہے، کوئی اور نہیں جو ان الفاظ میں کلام کرسکے۔

"اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا" (ابراہیم ۳۲) یہ ایک ایسا جملہ ہے جو ایک خدا کے سوا کسی اور کے حق میں کبھی بولا نہ جاسکا۔ اور یہی اس کی صداقت کی یقینی دلیل ہے۔ کیوں کہ اتنا بڑا بیان وہی دے سکتا ہے جو واقعۃً خالق کائنات ہو۔ کسی دوسرے کے لیے ممکن ہی نہیں کہ وہ اتنا بڑا بیان دینے کی جرأت کرسکے۔ چنانچہ ساری معلوم تاریخ میں کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں جس نے یہ کہنے کی ہمت کی ہو کہ "میں نے زمین و آسمان کو بنایا ہے"۔

"اگر اللہ قیامت تک تمہارے اوپر رات کردے تو اللہ کے سوا کون ہے جو تم کو روشنی دے۔ اور اگر اللہ قیامت تک تمہارے اوپر مستقل دن کردے تو اللہ کے سوا کون ہے جو تمہارے لیے رات لے آئے" (القصص ۷۱) ان الفاظ کا بولنا اللہ کے سوا کسی کے لیے سزاوار نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی کوئی شخص جرأت نہ کرسکا کہ وہ یہ الفاظ اپنی زبان سے نکالے۔ اور یہی اس بات کی کافی دلیل ہے کہ یہ خدا کا کلام ہے۔

قرآن میں کہا گیا ہے کہ بے شک اللہ ہی ہے جو آسمانوں اور زمین کو تھامے ہوئے ہے کہ وہ ٹل نہ جائیں۔ اور اگر وہ ٹل جائیں تو اللہ کے بعد کوئی دوسرا ان کو تھامنے والا نہیں (فاطر ۴۱) ان الفاظ پر غور کیجیے۔ کون ہے جو ان الفاظ کو بولنے کی جرأت کرسکے۔ یہ الفاظ وہی بول سکتا ہے جو زمین و آسمان سے بلند ہو، جو فی الواقع یہ طاقت رکھتا ہو کہ وہ زمین و آسمان کو پوری طرح قابو میں رکھ سکے۔ کوئی شخص فرضی طور پر یہ الفاظ نہیں بول سکتا۔ یہ خدائی کلام ہے اور خدائی کلام صرف خدا ہی بول سکتا ہے۔ کوئی انسان خدائی کلام اپنے منہ سے نکالنے پر قادر نہیں۔

اسلامی رواداری

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) کے مقالہ نگار نے سائنس کی تاریخ (History of Science) کے موضوع پر تفصیلات پیش کرتے ہوئے اعتراف کیا ہے کہ جس وقت اسلامی تہذیب عروج پر تھی اس وقت مغربی یورپ میں تہذیب بالکل پست حالت میں تھی۔ پیغمبر اسلام کے پیروؤں کی فتوحات ساتویں صدی عیسوی میں شروع ہوئیں۔ دسویں صدی عیسوی تک یہ حال ہوا کہ ایران سے لے کر اسپین تک تمام قوموں کی علمی زبان عربی بن چکی تھی۔ عرب فاتحین عام طور پر ان ملکوں میں امن اور خوش حالی لے آئے جہاں وہ آباد ہوئے۔ مثال کے طور پر اسپین میں قرطبہ کے کتب خانہ میں اس وقت پانچ لاکھ سے بھی زیادہ کتابیں تھیں جب کہ پیرینیز کے شمال میں مشکل سے پانچ ہزار کتابیں پائی جاتی تھیں۔ مزید یہ کہ مسلمان دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کے لیے بھی روادار تھے۔ چنانچہ مسلم عہد حکومت میں یہودی اعلیٰ ترین عہدوں پر فائز تھے جب کہ اسی زمانے میں یورپ کا یہ حال تھا کہ وہاں انھیں زندہ رہنے کا حق بھی مشکل سے دیا جاتا تھا :

> The Muslims were tolerant of the other monotheistic faiths. So that Jews rose to high position in Islamic lands at a time when they were scarcely permitted survival in Europe (16/368).

موسیٰ بن میمون (۱۱۳۵ء — ۱۲۰۴) یہود کے اکابر علماء میں سے تھا۔ وہ کلدانی، یونانی، عبرانی اور عربی زبانیں جانتا تھا۔ یہود کے یہاں اس کی عظمت اتنی زیادہ تھی کہ انھوں نے اس کو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے تشبیہ دی۔ انھوں نے کہا کہ موسیٰ سے موسیٰ تک موسیٰ جیسا کوئی شخص پیدا نہیں ہوا (من موسیٰ الیٰ موسیٰ لم یظھر واحد کموسیٰ)

موسیٰ بن میمون کی پیدائش اندلس کے شہر قرطبہ میں ہوئی۔ اس کے بعد وہ مصر پہونچا۔ اس وقت صلاح الدین ایوبی مصر کا حکمراں تھا۔ اس نے موسیٰ بن میمون کو اپنا طبیب خاص مقرر کیا۔ موسیٰ بن میمون کی یہودیت کے باوجود صلاح الدین ایوبی نے اس کی قدر و منزلت میں کوئی کمی نہ کی۔

نگرانی میں

امریکی صدر کی رہائش گاہ کا نام وہائٹ ہاؤس ہے۔ یہاں دنیا کا سب سے زیادہ طاقتور انسان رہتا ہے۔ وہ ایک بٹن دبا کر ہیلی کاپٹر بلا سکتا ہے۔ دوسرا بٹن دبا کر عالمی جنگ چھیڑ سکتا ہے۔ مگر خود وہ دنیا کا سب سے زیادہ مجبور انسان ہے۔ وہائٹ ہاوس میں تحفظ (Security) کے لیے اتنے سخت انتظامات ہیں کہ صدر کو احساس ہونے لگتا ہے کہ وہ زیرِ حفاظت نہیں ہے بلکہ زیرِ نگرانی ہے :

He is under surveillance rather than under protection.

سابق صدر امریکہ کی ایک نوجوان لڑکی نے اپنی کتاب (سوینیر) میں لکھا ہے کہ وہائٹ ہاؤس میں قیام کے زمانہ میں وہ کسی لڑکے سے محبت کا تعلق قائم نہ کر سکی۔ کیوں کہ وہاں تخلیہ میں اس کے لیے کچھ کرنا ممکن نہ تھا۔ اس نے اپنا یہ ذہن بنایا کہ وہ جب تک وہائٹ ہاؤس میں ہے وہ شادی نہیں کرے گی۔ قارئین کو مخاطب کرتے ہوئے وہ کہتی ہے کہ ذرا ان تاثرات کا اندازہ کیجیے جب کہ ایک دوست لڑکے کو دروازہ پر شب بخیر کہنا ہو، جہاں روشنیوں کا طوفان ہو اور خفیہ پولیس کا آدمی بھی اسی کے ساتھ موجود ہو۔ ایسے موقع پر آپ ہاتھ ملانے سے زیادہ اور کچھ نہیں کر سکتے، اور وہ نسبت کا معاملہ طے کرنے کے لیے کافی نہیں :

One of the young daughters of the former President wrote in her book, *Souvenir*, that she could not make any love affair during her stay in the White House as there was nothing she could do in private. She had made up her mind not to marry while she lived in the White House. She asked the reader to consider the effect of saying good night to a boy at the door, in a blaze of floodlights, with a Secret Service man in attendance. There is not much you can do except shake hand, and that's no way to get engaged.

The Hindustan Times, May 31, 1986 p. 17

وہائٹ ہاؤس کے آدمی کو صرف یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ دیکھا جا رہا ہے، اس کو یہ اندیشہ نہیں ہوتا کہ اس کو سزا ملے گی، اس کے باوجود وہ اس قدر محتاط ہو جاتا ہے۔ پھر جو شخص اس احساس سے دبا ہوا ہو کہ خدا اس کو ہر لمحہ دیکھ رہا ہے وہ کتنا زیادہ محتاط ہو جائے گا۔

نفسیاتِ جرم

ایک اطالوی ڈاکٹر لومبروسو (Cesare Lombroso) نے انیسویں صدی میں کچھ لوگوں کے سروں کی پیمائش کی۔ اس کے بعد اس نے دعویٰ کیا کہ غیر مجرم لوگوں کے مقابلہ میں مجرم لوگوں کے دماغ (Brain) جسامت میں چھوٹے ہوتے ہیں۔ بالفاظ دیگر جو شخص مجرم ہوتا ہے وہ پیدائشی طور پر مجرم ہوتا ہے۔ مگر اب یہ نظریہ نہیں۔ آج یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ تربیت نہ کہ فطرت وہ چیز ہے جو کسی کو مجرم بناتی ہے:

Nurture, not nature, is responsible for criminal behaviour.

حال میں امریکہ میں ایک کتاب چھپی ہے جس کا نام ہے جرم اور فطرتِ انسانی:

Crime and Human Nature
by Prof. James Q. Wilson and Prof. Richard Herrnstein
Published by Simon and Schuster, New York

اس کتاب میں جرم اور مجرم کا مطالعہ کرتے ہوئے جو باتیں کہی گئی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ مجرم فوری مقصد کو سامنے رکھنے والے لوگ ہوتے ہیں۔ ان کے اس ذہن کی وجہ سے ان کے لیے مشکل ہو جاتا ہے کہ وہ مستقبل کے بارہ میں سوچیں یا باقاعدہ منصوبہ بنائیں:

Criminals tend to be now-oriented personalities, which make planning or even thinking about the future difficult.

جرم کی اس نفسیات پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ اسلام عین مطابقِ حقیقت نظریہ ہے۔ اور اس کے مقابلہ میں جدید تہذیب کا نظریہ سراسر حقیقت کے خلاف ہے۔ اسلام آخرت رُخی ذہن بناتا ہے اور جدید تہذیب دنیا رُخی ذہن بناتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں اسلامی ذہن کی ساری توجہ "تب" پر ہوتی ہے اور جدید تہذیب کی ساری توجہ "اب" پر۔ اس طرح گویا اسلامی فکر مجرمانہ نفسیات کی جڑ کو کاٹ رہا ہے، جب کہ جدید تہذیب کا مادی ذہن مجرمانہ نفسیات کی پرورش کرنے والا ہے۔

آخرت کا سوال

خدا نے انسان کو ابدی مخلوق کی حیثیت سے پیدا کیا۔ پھر اس کے عرصۂ حیات (Life span) کے تقریباً سو سال کو موجودہ دنیا میں رکھ کر بقیہ ساری عمر کو موت کے بعد آنے والی اگلی دنیا میں ڈال دیا۔ اب بہترین عقل مندی یہ ہے کہ انسان اس آنے والی دائمی زندگی کو سامنے رکھ کر زندگی گزارے۔ اس کی زندگی آخرت رخی (Akhirat oriented) زندگی ہو۔

ایک مغربی مفکر نے لکھا ہے :

It is a question for us now to consider whether we have any personal relations towards the Supreme Power; whether there exists another world in which we shall be requited according to our actions. Not only is this a grand problem of philosophy; it is of all questions the most practical for us, the one in which our interests are most vitally concerned. This life is short, and its pleasures are poor; when we have obtained what we desire it is nearly time to die. If it can be shown that by living in a certain manner, eternal happiness may be obtained, then clearly no one except a fool or a mad man will refuse to live in such a manner (p. 414).

Winwood Reade
The Martyrdom of Man
London, Watts & Co. 1948, pp. 444

"ہمارے لیے یہ ایک غور طلب سوال ہے کہ کیا خالق کائنات اور ہمارے درمیان کوئی ذاتی رشتہ ہے۔ کیا موجودہ دنیا کے علاوہ کوئی اور دنیا ہے جس میں ہم اپنے اعمال کے مطابق بدلہ پائیں گے یہ نہ صرف فلسفہ کا بہت بڑا سوال ہے، یہ خود ہمارے لیے سب سے زیادہ عملی سوال ہے، ایک ایسا سوال جس سے ہمارے مفادات بہت زیادہ وابستہ ہیں۔ موجودہ زندگی بہت مختصر ہے۔ اس کی خوشیاں نہایت معمولی ہیں۔ جب ہم وہ کچھ حاصل کر لیتے ہیں جو ہم چاہتے ہیں تو ہمارے مرنے کا وقت قریب آچکا ہوتا ہے۔ اگر یہ واضح ہو سکے کہ ایک خاص طریقہ پر زندگی گزارنے سے دائمی خوشی حاصل ہو سکتی ہے تو بیوقوف یا پاگل کے علاوہ کوئی بھی شخص نہیں ہوگا جو اس طرح زندگی گزارنے سے انکار کرے۔"

آخرت کا مسئلہ کس قدر اہم ہے، مگر انسان کتنی آسانی کے ساتھ اس کو نظر انداز کر دیتا ہے۔

خدا کے نام پر

خدا بڑا ہے، اور کوئی بڑا نہیں ـــــ بظاہر صد فی صد خیر کی بات ہے۔ مگر یہ بظاہر خیر کی بات بھی عملاً شر کی بات بن جاتی ہے جب کہ آدمی نے اس کو صرف آدھی شکل میں دریافت کیا ہو۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ خدا بڑا ہے، اس کے سوا کوئی بڑا نہیں۔ مگر اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ انسان چھوٹا ہے، اس سے زیادہ اور کوئی چھوٹا نہیں۔ آدمی اگر ان دونوں باتوں کو جانے تو اس کے اندر تواضع کی کیفیت پیدا ہوگی۔ اور اگر وہ صرف پہلی بات کو جانے اور دوسری بات کو نہ جانے تو اس سے اس کے اندر جو مزاج پیدا ہوگا اسی کا نام سرکشی ہے۔

شیطان کو معلوم تھا کہ خدا بڑا ہے، مگر اس کو یہ نہ معلوم تھا کہ میں چھوٹا ہوں۔ چنانچہ وہ ابدی طور پر شر اور فساد کا کارخانہ بن گیا۔ اسی طرح ہٹلر اس بات کو جانتا تھا کہ خدا بڑا ہے، مگر وہ اس بات کو نہیں جانتا تھا کہ میں چھوٹا ہوں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ تاریخ کا سب سے زیادہ سرکش اور مفسد انسان قرار پایا۔

"خدا بڑا ہے" کہنا ایک خارجی حقیقت کا اقرار کرنا ہے۔ اور "میں چھوٹا ہوں" کہنا اپنے آپ کو اس خارجی حقیقت کے مطابق ڈھالنا ہے۔ کچھ لوگ خدا کو ایک عظیم خارجی حقیقت کے طور پر تسلیم کرتے ہیں مگر وہ اپنی ذات کو اس کے مطابق نہیں ڈھالتے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ خدا کے نام پر خود خدا بن جاتے ہیں۔ وہ لوگوں سے لڑتے ہیں، حالاں کہ خدا کو بڑا ماننے کا تقاضا تھا کہ ان سے لڑائی کا ہر جذبہ چھن جائے۔ وہ لوگوں پر زبان درازی کرتے ہیں، حالاں کہ خدا کی خدائی کا احساس جس کے دل میں پیدا ہو جائے اس کے الفاظ اس سے گم ہو جاتے ہیں۔ وہ اس قابل نہیں رہتا کہ لوگوں کو اپنی زبان درازی کا نشانہ بنائے۔

ہر حقیقت اس وقت تک آدھی حقیقت ہے جب تک آدمی اس کے مقابلہ میں خود اپنی حیثیت کو دریافت نہ کرے۔ خارجی حقیقت کی دریافت اس وقت مکمل ہوتی ہے جب کہ اس کی نسبت سے آدمی اپنے واقعی مقام کو بھی جان لے۔ جس آدمی کو پہلی بات معلوم ہو، اور دوسری بات اس کو معلوم نہ ہو، اس کا سارا رویہ اس دنیا میں غلط ہو کر رہ جائے گا۔

عین وقت پر

امتحان کسی طالب علم کی زندگی کا سب سے زیادہ نازک لمحہ ہوتا ہے۔ مگر یہی نازک لمحہ وہ لمحہ ہے جب کہ کسی طالب علم کی زندگی کا آخری فیصلہ کیا جاتا ہے۔ جو طالب علم امتحان کی نزاکتوں کو سوچ کر امتحان دینے سے رک جائے اس نے اپنے مستقبل کو ہمیشہ کے لیے برباد کر لیا۔ وہ عین اسی وقت فیل ہو گیا جب کہ اس کو پاس ہونے کا سرٹیفکٹ حاصل کرنا چاہیے تھا۔

ایسا ہی کچھ معاملہ مومن و مسلم کا بھی ہے۔ قرآن سے یہ ثابت ہے کہ کسی شخص کے لیے جنت کا فیصلہ اس وقت تک نہیں ہوتا جب تک ایسا نہ ہو کہ اس کو آزمائش میں ڈالا جائے اور وہ آزمائش میں پورا اترے۔ آزمائش کے لمحات آنے پر اپنے آپ کو اس سے بچانا ایسا ہی ہے جیسے کسی طالب علم کے لیے امتحان کا انتظام کیا جائے اور وہ اس کی سختیوں سے گھبرا کر بھاگ کھڑا ہو۔

ایک شخص معمول کے حالات میں حق کا ساتھ دے رہا تھا اور جب کوئی مشکل مرحلہ آیا تو وہ حق کو چھوڑ کر اس سے الگ ہو گیا۔ ایک شخص مزاج کے موافق صورت حال میں اسلامی بنا ہوا تھا اور جب مزاج کے خلاف صورت حال سامنے آئی تو وہ اچانک غیر اسلامی بن گیا۔ ایک شخص معروف نقشہ میں دینداری دکھا رہا تھا مگر جب کوئی غیر معروف نقشہ سامنے آیا تو وہ دین دار بننے کے لیے تیار نہ ہوا۔ ایک شخص "ساحل" پر اسلام کی باتیں کر رہا تھا اور جب "دریا" کی موجوں سے سابقہ پیش آیا تو وہ اسلامی باتیں بھول کر بالکل مختلف انسان بن گیا۔

ایسی تمام مثالیں آزمائش میں پورا نہ ہونے کی مثالیں ہیں۔ ایسے تمام مواقع وہ مواقع تھے جب کہ اس کا خدا چاہتا تھا کہ اس کی جانچ کر کے اس کو جنت کے باغوں میں داخل کر دے۔ مگر عین وقت پر وہ جانچ میں پورا نہ اترا۔ اس کا رب اس کے پاس آیا مگر وہ پیٹھ پھیر کر اپنے رب سے دور چلا گیا۔

آہ وہ انسان، جس کے سامنے جنت کا دروازہ کھولا گیا۔ مگر عین وقت پر وہ جنت میں داخل ہونے سے باز رہا۔ وہ عین اس وقت ناکام ہو گیا جب کہ اس کو کامیاب ہونے کا ثبوت دینا چاہیے تھا۔

سرکشی

ایک لطیفہ ہے۔ ایک مسجد کے امام صاحب تھے۔ ان کے گھر پر محلہ کے بنیا کے یہاں سے سامان آیا کرتا تھا۔ گھر والے قرض پر سامان منگاتے رہے یہاں تک کہ رقم زیادہ ہو گئی۔ بنیا نے کہا کہ پہلے پچھلا قرض ادا کرو اس کے بعد اور سامان لے جاؤ۔

امام صاحب بنیا کی اس گستاخی پر خفا ہو گیے۔ جمعہ کے روز جب محلہ کے تمام لوگ مسجد میں جمع تھے، امام صاحب نے کہا کہ بھائیو، میں آپ کو ایک بات بتاتا ہوں اس کو سنو۔ تمہارے محلہ کا بنیا کافر و مشرک ہے۔ آپ میں سے کوئی شخص اس کے یہاں سے سامان نہ خریدے۔ اس کے بعد انھوں نے قرآن و حدیث کے نصوص پیش کیے اور کہا کہ ان آیتوں اور حدیثوں سے ثابت ہوتا ہے کہ جو شخص کافر و مشرک ہو اس سے معاشی تعلق نہیں رکھنا چاہیے۔ حاضرین میں سے ایک شخص نے اٹھ کر کہا "امام صاحب، بنیا تو ۲۵ برس سے یہاں دکان کر رہا ہے، پھر آج ہی یہ مسئلہ آپ کیوں بیان کر رہے ہیں"۔ امام صاحب نے بگڑ کر کہا: تم کافروں کے ساتھی ہو اس لیے تمہارا بھی بائیکاٹ ہونا چاہیے۔

امام صاحب نے بظاہر قرآن و حدیث کے حوالے دیئے تھے۔ مگر ظاہر ہے کہ اس خاص معاملہ میں خود امام صاحب غلطی پر تھے نہ کہ بنیا۔ اس معاملہ میں اصلی اور بنیادی بات صرف یہ تھی کہ امام صاحب کے اوپر بنیا کا حق تھا جس کو انھیں ادا کرنا چاہیے تھا۔ اس کے سوا امام صاحب نے جو باتیں کہیں وہ سب اصل مسئلہ کی نسبت سے غیر متعلق (Irrelevant) تھیں۔

یہی معاملہ آج کل مسلم معاشرہ کا ہو رہا ہے۔ ایک مسلمان دوسرے شخص کا حق مارے گا۔ اور جب حق دار اس سے اپنے حق کا مطالبہ کرے گا تو وہ حق دار کو اس کا حق لوٹانے کے بجائے یہ کرے گا کہ وہ اس کو طرح طرح سے بدنام کرنا شروع کر دے گا۔ حالاں کہ یہ سب غیر متعلق باتیں ہیں۔ مذکورہ مسلمان کو سب سے پہلے غصب شدہ حق لوٹانا چاہیے۔ اس کے بعد ہی وہ مزید جو کچھ کہنا چاہتا کہہ سکتا ہے۔ حق غصب کرنا غلطی ہے۔ اور غصب کرنے کے بعد صاحب حق کے خلاف بدنامی کی مہم چلانا غلطی پر سرکشی کا اضافہ ہے۔ یہ آدمی کے جرم کو بڑھاتا ہے، وہ کسی بھی درجہ میں اس کے جرم کو کم نہیں کرتا۔

واقفیت ضروری

قرآن میں قیامت کی عدالت کے بارہ میں ارشاد ہوا ہے کہ وہاں وہی شخص گواہی دے گا جو حق کی گواہی دے اور وہ اس کو جانتا ہو (لایملک الذین یدعون من دونہ الشفاعۃ الا من شھد بالحق وھم یعلمون ، الزخرف ۸۶)

یہی چیز دنیا کے معاملات میں بھی مطلوب ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایک مقدمہ پیش ہوا۔ اس میں ایک شخص گواہی دینے کے لیے آیا۔ آپ نے گواہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: اگر تم نے سورج کی طرح دیکھا ہو تو گواہی دو ورنہ اس سے الگ رہو۔ (اذا رأیت مثل الشمس فاشھد والا فدع ، احکام القرآن للجصاص)

اسی بنا پر فقہاء نے شہادت کا یہ اصول وضع کیا ہے کہ علم گواہی کے لیے شرط ہے۔ کوئی شخص جس واقعہ کی گواہی دینا چاہتا ہے اس کو اس واقعہ کا ذاتی علم ہونا چاہیے۔ اگر وہ متعلقہ واقعہ کا ذاتی علم نہیں رکھتا تو نہ اس کو گواہی دینا چاہیے اور نہ اس کی گواہی کا شرعی طور پر کوئی اعتبار ہے۔

اس سے معاملات میں شریعت کا مزاج معلوم ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک شخص کو معاشرہ میں کس طرح رہنا چاہیے۔ اس کو کیا بات بولنا چاہیے اور کیا بات نہیں بولنا چاہیے۔

ایک شخص کے کسی معاملہ میں آپ رائے دینے جا رہے ہوں تو پہلے سوچ لیجئے کہ کیا آپ اس معاملہ میں ضروری واقفیت رکھتے ہیں۔ کیا اس معاملہ میں آپ کی واقفیت اس درجہ کو پہونچ چکی ہے کہ اس کو ذاتی علم کہا جا سکے۔ اگر آپ مذکورہ معاملہ میں ذاتی علم کی حد تک واقف ہو چکے ہیں تو آپ اس معاملہ میں بولیے ورنہ خاموش رہیے۔

مزید یہ کہ یہ بات کہ آپ مذکورہ معاملہ سے پوری طرح واقف ہیں یہ بھی اس وقت درست قرار پائے گا جب کہ وہ از روئے واقعہ بھی درست ہو۔ ورنہ خدا کی عدالت میں آپ مجرم قرار پائیں گے، خواہ بطور خود اپنے آپ کو واقف کار سمجھ رہے ہوں۔

ایمان وعمل

عن ابی العالیۃ قال کان اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یرون انہ لایضر مع لا الہ الا اللہ ذنب کما لاینفع مع الشرک عمل فنزلت (اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول ولا تبطلوا اعمالکم) فخافوا ان یبطل الذنب العمل

(تفسیر ابن کثیر، الجزء الرابع صفحہ ۱۸۱)

حضرت ابوالعالیہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب یہ خیال کرتے تھے کہ لا الٰہ الا اللہ کے ساتھ کوئی گناہ نقصان نہ پہونچائے گا جس طرح شرک کے ساتھ کوئی عمل فائدہ نہیں پہونچاتا۔ اس پر یہ آیت اتری: اے ایمان والو تم اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور اپنے اعمال کو ضائع نہ کرو (محمد ۳۳) اس کے بعد وہ ڈرنے لگے کہ گناہ عمل کو باطل کر دیتا ہے۔

ایمان ایک قسم کا معاہدہ ہے۔ بندہ جب ایمان کے الفاظ اپنی زبان سے دہراتا ہے تو وہ اللہ سے یہ اقرار کرتا ہے کہ وہ ایک اللہ کو اپنا بڑا جانے گا۔ وہ اپنے قول وعمل میں صرف اس طریقہ کی پیروی کرے گا جو اللہ نے اپنے رسول کے ذریعہ بتایا ہے۔

اب اگر ایسا ہو کہ ایک شخص معاہدہ کے الفاظ تو بول دے مگر اپنے حقیقی رویہ میں وہ اس کی خلاف ورزی کرے تو اس کا معاہدہ اللہ کی نظر میں باطل ہو جائے گا۔ وہ اس کو کچھ فائدہ نہ پہونچا سکے گا۔

وہی ایمان قابل اعتبار ایمان ہے جو آدمی کو اپنی پکڑ میں لے لے۔ آدمی بولے تو وہی بولے جو ایمان کے مطابق اسے بولنا چاہیے۔ آدمی کرے تو وہی کرے جو ایمان کے مطابق اسے کرنا چاہیے اس کا ایمان اس کی زندگی کے اوپر حاکم بن جائے۔

دنیا کا ہر معاہدہ اپنے عمل کے اعتبار سے جانچا جاتا ہے۔ اگر معاہدہ اور عمل میں مطابقت ہے تو معاہدہ برقرار رہتا ہے۔ ورنہ معاہدہ توڑ دیا جاتا ہے۔ اسی طرح ایمان کے معاہدہ کو بھی عمل کے اعتبار سے جانچا جائے گا۔ اگر آدمی کا عمل اس کے ایمان کے مطابق ہے تو اللہ اس کے معاہدۂ ایمان کو قبول کرے گا۔ ورنہ وہ اس کو رد کر دے گا۔ ایسا ایمان اللہ کے یہاں بے قیمت قرار پائے گا جس کے ساتھ عمل شامل نہ ہو۔

ایمان کی آزمائش

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ مومن بننے کے لیے صرف اتنا کافی نہیں کہ آدمی اپنی زبان سے کہہ دے کہ "میں مومن ہوں"۔ اقرار ایمان کے بعد حالات میں ڈال کر آدمی کی آزمائش کی جاتی ہے۔ اور جب آدمی آزمائش کے بعد اپنے ایمان پر قائم رہتا ہے تب اس کا ایمان اللہ کے نزدیک قابل اعتبار قرار پاتا ہے اور وہ حقیقی معنوں میں وہ مومن بنتا ہے جس کے لیے خدا نے جنت کے محل تیار کر رکھے ہیں۔

ایمان لانا دوسرے لفظوں میں اللہ کو اپنا بڑا بنانا ہے۔ آزمائش اسی لیے ہوتی ہے کہ یہ معلوم ہو جائے کہ آدمی نے فی الواقع اللہ کو اپنا بڑا بنایا ہے۔ یا حقیقی طور پر اس کے نزدیک بڑا کوئی اور ہے اور وہ صرف زبان سے خدا کی بڑائی کے الفاظ بول رہا ہے۔ آدمی جب حالات کی آزمائش میں پڑتا ہے اس وقت فوراً معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کے نزدیک بڑا (سپریم) کون ہے۔ کس کو وہ سب سے زیادہ لحاظ کے قابل سمجھتا ہے اور کس کو لحاظ کے قابل نہیں سمجھتا۔

حالات بار بار آدمی کو ایسے موڑ پر لاتے ہیں جہاں ایک طرف خدا کے تقاضے ہوتے ہیں اور دوسری طرف دوسری چیزوں کے تقاضے۔ ایک طرف خدا اور اس کا دین ہوتا ہے اور دوسری طرف آدمی کا مادی مفاد، اس کی دنیوی مصلحتیں، اس کے بیوی اور بچے، اس کا نفس اور اس کی انا، ایسے مواقع ہی پر معلوم ہوتا ہے کہ آدمی کیا ہے اور کیا نہیں ہے۔

اب ایک انسان وہ ہے جو تمام چیزوں کو نظر انداز کر کے خدا کو پکڑ لے۔ اس کے مفادات مجروح ہوں، اس کے بچوں کی آرزوئیں ذبح ہو رہی ہوں، اس کی انا کا بت ٹوٹ رہا ہو مگر وہ ان سب کو نظر انداز کر دے اور خدا پر ایمان کا جو تقاضا ہے اس کو پوری طرح اختیار کر لے۔

دوسرا انسان وہ ہے جو نازک مواقع پر خدا کی پکار کو بھول جائے۔ وہ ایمان کے تقاضوں کو نظر انداز کر کے اپنے مفادات کی طرف اور اپنے بیوی بچوں کی طرف جھک جائے۔ وہ اپنی ذاتی مصلحتوں کو بچانے کی خاطر خدائی مصلحتوں کو فراموش کر دے۔ یہ دوسری قسم کے لوگ خدا کے یہاں غیر مومن قرار دیئے جائیں گے، خواہ زبان سے انھوں نے کتنا ہی زیادہ اپنے مومن ہونے کا دعویٰ کیا ہو۔

تلبیس

قرآن میں یہود کو جن باتوں کا مجرم قرار دیا گیا ہے ان میں سے ایک تلبیس الحق بالباطل ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوا ہے:

ولاتلبسوا الحق بالباطل وتکتموا الحق وانتم تعلمون (البقرہ ۴۲) اور صحیح میں غلط کو نہ ملاؤ اور سچ کو نہ چھپاؤ حالاں کہ تم جانتے ہو۔

لبس الشئ بالشئ کے معنی ہیں ایک چیز کو دوسری چیز کے ساتھ گڈ مڈ کرنا۔ حضرت عبداللہ بن عباس نے اس کی تشریح ان الفاظ میں کی ہے کہ حق کو باطل کے ساتھ خلط ملط نہ کرو۔ (لاتخلطوا الحق بالباطل)

قدیم عرب میں یہود کو مذہبی سیادت کا مقام حاصل تھا۔ مذہبی معاملہ میں کسی کو کچھ دریافت کرنا ہوتا تو وہ یہودی علماء کے پاس جاتا تھا۔ چنانچہ پیغمبر اسلام کا ظہور ہوا تو عرب لوگ یہودی عالموں کے پاس جاکر پوچھنے لگے کہ ان کے بارہ میں آپ کی کیا رائے ہے۔

پیغمبر اسلام کو ماننے سے یہود کی مذہبی بڑائی ختم ہوتی تھی۔ اس لیے انھوں نے آپ کی مخالفت شروع کر دی۔ غلط غلط باتیں پھیلا کر وہ لوگوں کو آپ سے بدظن کرنے لگے۔ جب کوئی شخص ان کے یہاں جاکر آپ کے بارہ میں پوچھتا تو وہ ایسا کرتے کہ غیر متعلق باتیں چھیڑ کر لوگوں کو آپ کی طرف سے مشتبہ کر دیتے۔ ایک مفسر کے الفاظ میں "ہر سائل کے دل میں وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف، آپ کی جماعت کے خلاف اور آپ کے مشن کے خلاف کوئی نہ کوئی وسوسہ ڈال دیتے تھے۔ کوئی الزام آپ پر چسپاں کر دیتے تھے۔ کوئی ایسا شوشہ چھوڑ دیتے تھے جس سے لوگ شکوک و شبہات میں پڑ جائیں۔"

ایک چیز دلیل سے ثابت ہو جائے، پھر بھی آدمی اس کو ماننا نہ چاہے تو اس کے بعد وہ یہ کرتا ہے کہ غیر متعلق باتیں چھیڑ کر اس کو بدنام کرنے کی مہم چلاتا ہے۔ جس چیز کو وہ دلیل سے غلط ثابت نہ کر سکا اس پر عیب لگا کر وہ اس کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ مگر اس قسم کا فعل آدمی کے جرم کو بڑھاتا ہے، وہ کسی بھی درجہ میں اس کے جرم کو گھٹانے والا نہیں۔

کم بولنا زیادہ سننا

کتب رجل الی حکیم یقول : لِمَ تبخل علی الناس بالکلام۔ فقال الحکیم : اِنَّ الخالق سبحانہ قد خلق لنا اُذنین ولسانا واحداً لنسمع اکثر مما نتکلم ، لا اَن نتکلم اکثر مما نسمع

ایک آدمی نے ایک دانا شخص کو لکھا کہ آپ لوگوں سے کلام کرنے میں کیوں بخل سے کام لیتے ہیں ۔ دانا نے جواب دیا کہ خالق عزوجل نے ہمارے لیے دو کان پیدا کیے اور ایک زبان بنائی ۔ تاکہ ہم بولنے سے زیادہ سنیں ۔ نہ کہ سننے سے زیادہ بولیں ۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان کے لیے درست طریقہ یہی ہے کہ وہ کم بولے اور زیادہ سنے۔ یہی کسی انسان کا صحیح ترین مزاج ہے اور اسی میں دنیا اور آخرت کی کامیابی ہے، زیادہ سننے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی زیادہ جاننے کی کوشش کرے۔ آدمی جتنا زیادہ جانے گا اتنا ہی زیادہ وہ صحیح بول پائے گا۔ اس کے برعکس زیادہ بولنے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کمتر معلومات کے باوجود بولنے لگے۔ ایسے شخص کا کلام سطحی ہو کر رہ جائے گا۔

آدمی جب دوسرے کی بات سنتا ہے تو اس کی معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ دوسرے کے نقطۂ نظر کو جاننے کے بعد وہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ اپنے نقطہ نظر کو زیادہ طاقت ور اور زیادہ مطابق واقعہ بنا کر پیش کر سکے۔ سننے سے پہلے بولنے میں یک طرفہ طور پر صرف اپنے ذہن کی رعایت ہوتی ہے۔ مگر جب آدمی دوسروں کی سن کر بولے تو اس کے کلام میں اپنے ساتھ دوسروں کی رعایت بھی شامل ہو جاتی ہے۔ اس کا کلام دو طرفہ صداقت کا حامل بن جاتا ہے۔

زیادہ سننا اور کم بولنا صرف ایک صفت نہیں ، وہ صفات کا مجموعہ ہے۔ وہ آدمی کی پوری شخصیت کی ایک علامت ہے۔ اس کا مطلب ہے تواضع ، سنجیدگی ، خوش اخلاقی ، دوسروں کی رعایت اور معاملات کو گہرائی کے ساتھ دیکھنے کا مزاج۔ اس کے برعکس کم سننا اور زیادہ بولنا ایک ایسی شخصیت کی علامت ہے جس کے اجزار ہیں سطحیت ، بے اخلاقی ، ذاتی اظہار ، سرسری معلومات پر رائے قائم کرنا اور احساس ذمہ داری کے بغیر کلام کرنا۔

معروف و منکر

شریعت میں جو احکام ہیں ان میں سے ہر حکم کے لیے الگ الگ الفاظ ہیں۔ کسی حکم کے لیے صلوٰۃ کا لفظ ہے اور کسی حکم کے لیے صوم کا۔ کسی حکم کے لیے زکوٰۃ کا لفظ آیا ہے اور کسی حکم کے لیے حج کا، وغیرہ۔ اسی طرح ایک حکم وہ ہے جس کے لیے قرآن و حدیث میں الامر بالمعروف والنہی عن المنکر کے الفاظ آئے ہیں۔ یعنی اچھی باتوں کا حکم دینا اور بری باتوں سے روکنا۔ حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ مسلمان کے اوپر لازم ہے کہ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کام کرے، طاقت ہو تو ہاتھ سے۔ ہاتھ سے نہ کر سکے تو زبان سے، اور زبان سے نہ کر سکے تو دل سے۔

یہ حکم دراصل مسلمانوں کی باہمی اصلاح کے لیے آیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر مسلمان دوسرے مسلمان کے اوپر نگران بن جائے۔ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو اس کا حق نہ دے تو قریب کے مسلمان اس پر زور ڈال کر اس کو حق دار کا حق دینے پر مجبور کریں۔ ایک مسلمان ظالمانہ روش اختیار کرے تو اس کے آس پاس جو مسلمان ہیں وہ سب مل کر اس کے پیچھے پڑ جائیں اور اس کو ظلم و سرکشی کا رویہ چھوڑنے پر مجبور کر دیں۔ یہ کام اپنی استطاعت کے بقدر کرنا ہے۔ ہاتھ سے ممکن ہو تو ہاتھ سے، ورنہ زبان سے، اور زبان سے ممکن نہ ہو تو آخری درجہ یہ ہے کہ دل سے۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی اسی خاص نوعیت کی بنا پر قرآن میں اس کے لیے مشارکت کے صیغے آئے ہیں، یعنی ایسا صیغہ جس میں آپس میں ایک دوسرے کے اندر کرنے کا مفہوم پایا جاتا ہو۔ مثلاً ائتمار بالمعروف (وائتمروا بینکم بمعروف، الطلاق ۶) اور تناہی عن المنکر (کانوا لا یتناھون عن المنکر فعلوہ، المائدہ ۷۹)

مسلمانوں کی اصلاح معاشرہ کے لیے یہی اصل کام ہے جو مسلمانوں کو کرنا ہے۔ اس حکم کا مطلب یہ کہ مسلمان کے اندر اپنے بھائی کی مدد کرنے کا جذبہ موجود ہو۔ جہاں کوئی مسلمان حق کے خلاف چلتا ہوا نظر آئے فوراً اس علاقہ کے مسلمان ایسے مسلمان سے ملیں، وہ ظالم کے خلاف مظلوم کی حمایت کریں۔ وہ ہر شخص کے معاملہ میں دخل دے کر اس کو حق پر قائم رہنے اور ناحق کو چھوڑنے پر مجبور کر دیں۔ یہ حقیقتاً ایک سماجی کام ہے نہ کہ کوئی حکومتی کام۔

احتساب

دنیا میں سب کم جو چیز پائی جاتی ہے وہ احتساب خویش ہے۔ اور جو چیز دنیا میں سب سے زیادہ پائی جاتی ہے وہ احتساب غیر ہے۔ آج ہر چھوٹا بڑا آدمی دوسروں کے احتساب میں مشغول ہے۔ مگر وہ انسان کہیں نظر نہیں آتا جو اپنا احتساب آپ کر رہا ہو۔

آدمی باطل کلام بولتا ہے مگر اس کو کبھی یہ تڑپ نہیں ہوتی کہ اس نے اپنی زبان سے باطل کلام نکالا ہے۔ آدمی واضح طور پر بے انصافی کرتا ہے مگر اس کو کبھی یہ احساس نہیں ہوتا کہ اس سے بے انصافی کا فعل سرزد ہوا ہے۔ آدمی دوسروں کے ساتھ برا سلوک کرتا ہے مگر اس کو توفیق نہیں ہوتی کہ پیچھے مڑ کر اپنے آپ کو دیکھے۔

لوگ اپنے ذاتی مفاد کے معاملہ میں حساس ہیں مگر وہ حق کے معاملہ میں بے حس ہو گیے ہیں۔ ان کی انا پر ضرب لگے تو وہ تڑپ اٹھتے ہیں مگر وہ حق و صداقت پر ضرب لگاتے ہیں اور ان کے اندر اس کے خلاف کوئی تڑپ پیدا نہیں ہوتی۔

لوگوں کے اسی مزاج کا یہ نتیجہ ہے کہ اگر ان کے درمیان کوئی ایسی تحریک اٹھائیے جس کی زد ان کی اپنی ذات پر پڑتی ہو تو ایسی تحریک کو لوگوں کے درمیان کوئی مقبولیت حاصل نہیں ہوگی۔ وہ ایسی تحریک کو اس طرح نظر انداز کر دیں گے جیسے کہ وہ کوئی قابل لحاظ چیز ہی نہیں۔

اس کے برعکس لوگوں کے درمیان ایسی تحریک اٹھائی جائے جس کی زد دوسروں کے اوپر پڑتی ہو تو وہ جوق در جوق اس کو لبیک کہیں گے۔ دوسروں کو غلط قرار دینا، دوسروں کے خلاف تقریریں کرنا، دوسروں کے خلاف ایجی ٹیشن چلانا، دوسروں کے خلاف ہنگامہ آرائی کرنا لوگوں کا محبوب ترین مشغلہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جن تحریکوں میں اس طرح کی غذا ہو ان کو فوراً مقبولیت مل جاتی ہے۔ اس کے لیڈر فوراً شہرت کا مقام حاصل کر لیتے ہیں۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ احتساب خویش اگر دین ہے تو احتساب غیر سراسر بے دینی۔ جو لوگ اس طرح کے لایعنی مشغلوں میں مصروف ہیں وہ بہت جلد دیکھ لیں گے کہ وہ صرف بربادی کی خندق کی طرف سفر کر رہے تھے، اگرچہ بطور خود انھوں نے سمجھا تھا کہ وہ کامیابی کے چمنستان کی طرف چلے جا رہے ہیں۔

جھوٹی شکایت

انسانی سماج میں جو چیز سب سے زیادہ عام ہے وہ جھوٹی شکایت ہے اور جو چیز اس سے بھی زیادہ عام ہے وہ ہے جھوٹی شکایت کو سن کر فوراً اسے مان لینا۔ مگر یہ دونوں ہی چیزیں سراسر باطل ہیں۔ شکایت کا پیدا ہونا اگر بذات خود کوئی اہمیت رکھتا ہو تو دنیا کا کوئی شخص بھی قابل اعتبار نہیں، حتیٰ کہ نعوذ باللہ پیغمبر بھی نہیں۔ کیوں کہ دنیا میں کوئی بھی شخص ایسا نہیں جس کے بارہ میں شکایت کرنے والوں نے شکایتیں نہ کی ہوں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بلاشبہہ معصوم تھے۔ مگر سیرت اور حدیث کی کتابیں بتاتی ہیں کہ آپ کے زمانہ کے یہود اور منافقین نے آپ کے اوپر طرح طرح کے الزامات لگائے۔ حتیٰ کہ وہ لوگ جن کو صحابی کہا جاتا ہے ان میں بھی ایسے افراد نکلے جنھیں آپ کے بارہ میں غلط فہمیاں پیدا ہوئیں اور اس کا اظہار ہوا۔ یہاں صرف ایک واقعہ بطور مثال نقل کیا جاتا ہے۔

غزوۂ حنین کے بعد کافی مالِ غنیمت ملا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اموال کو لوگوں میں تقسیم کر رہے تھے۔ اس دوران ایک مسلمان کا واقعہ پیش آیا۔ یہ واقعہ سیرۃ ابن ہشام میں ان الفاظ میں نقل کیا گیا ہے:

خرجتُ انا وتلیدُ بن کلاب اللیثی حتی أتینا عبد اللہ بن عمرو بن العاصؓ وھو یطوف بالبیت معلّقاً نعلہ بیدہ۔ فقلنا لہ۔ ھل حضرتَ رسولَ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حین کلّمہ التمیمی یوم حُنین۔ قال نعم۔ جاء رجل من بنی تمیم یُقال لہ ذوالخُویصرۃ۔ فوقف علیہ وھو یعطی الناس۔ فقال یامحمد۔ قد رأیتُ ماصنعتَ فی ھٰذا الیوم

راوی کہتے ہیں کہ میں اور تلید بن کلاب لیثی نکلے۔ یہاں تک کہ ہم عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ کے پاس پہونچے۔ اور وہ اپنے ہاتھ میں جوتا لیے ہوئے کعبہ کا طواف کر رہے تھے۔ ہم نے ان سے کہا، کیا آپ اس وقت موجود تھے جب تمیمی نے حنین کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کلام کیا۔ انھوں نے کہا ہاں۔ بنو تمیم کا ایک آدمی آیا۔ اس کو ذوالخویصرہ کہا جاتا تھا۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھ گیا اور آپ لوگوں کو عطیات دے رہے تھے۔

فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم۔ اجل فكيف رأيتَ۔ فقال لم ارَكَ عدلتَ۔ قال فغضب النبی صلی الله علیه وسلم ثم قال ويحكَ۔ اذا لم يكن العدل عندی فعند من يكون

(الجزء الرابع صفحہ ۱۴۴)

اس نے کہا اے محمدؐ، آج آپ نے جو کیا اس کو میں نے دیکھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا کہ تم نے کیا دیکھا۔ اس نے کہا میں نے نہیں دیکھا کہ آپ نے انصاف کیا ہو۔ راوی کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ سن کر غضب ناک ہو گئے۔ آپ نے فرمایا کہ تمہارا برا ہو۔ اگر میرے یہاں انصاف نہ ہو تو پھر کس کے یہاں انصاف ہو گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں مذکورہ مسلمان نے جو بات کہی، وہ اپنے نزدیک اس کی مضبوط بنیاد رکھتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس نے دیکھا کہ جنگ میں انصار اور مہاجرین دونوں نے حصہ لیا۔ دونوں نے یکساں طور پر سرفروشی کی۔ مگر جب مال غنیمت کی تقسیم کا وقت آیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سب کچھ قریش کو اور عرب قبیلوں کو دے دیا۔ مدینہ کے انصار کو آپ نے کچھ نہیں دیا (واعطى رسول الله صلى الله عليه وسلم ما اعطى فى قبائل قريش وقبائل العرب و لم يُعطِ الانصار شيئاً، صفحہ ۱۴۵)

اس معاملہ میں بہت سی باتیں ہوئیں۔ حتی کہ حسان بن ثابت انصاری نے ایک نظم لکھی جس کو ابن ہشام نے نقل کیا ہے۔ اس کا پہلا شعر یہ تھا:

زادَ الهمومُ فماءُ العينِ مُنْحَدِرُ   سَحّاً اذا حَفَلَتْهُ عَبْرَةٌ دِرَرُ

رنج و غم بڑھ گئے، پس آنکھ کا پانی برابر بہہ رہا ہے، جب کہ یہ پانی بہتے ہوئے آنسوؤں نے جمع کیا ہے۔

یہ شکایت بظاہر درست ہونے کے باوجود اپنی حقیقت کے اعتبار سے سراسر غلط تھی۔ شکایت کرنے والے سارے معاملہ کو بس شرکتِ جہاد کے اعتبار سے دیکھ رہے تھے۔ جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو مصلحتِ اسلام کے اعتبار سے دیکھا۔ شرکتِ جہاد عام حالات میں یقیناً قابل اعتبار ہے۔ مگر جب اس کا مقابلہ مصلحت اسلام سے ہو تو مصلحت اسلام کا پہلو قابل ترجیح قرار پائے گا ـــــ غلط زاویہ نگاہ سے دیکھنے میں ایک چیز نادرست نظر آسکتی ہے۔ مگر صحیح زاویۂ نگاہ سے دیکھئے تو وہی چیز عین درست نظر آنے لگے گی۔

برا نام دینا

یاایھا الذین اٰمنوا لایسخر قوم من قوم عسیٰ ان یکونوا خیرًا منھم ولا نساء من نساء عسیٰ ان یکن خیرا منھن ولا تلمزوا انفسکم ولا تنابزوا بالالقاب بئس الاسم الفسوق بعد الایمان ومن لم یتب فاولٰئک ھم الظالمون

(الحجرات ۱۱)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، نہ مرد دوسرے مردوں کا مذاق اڑائیں، شاید کہ وہ ان سے بہتر ہوں۔ اور نہ عورتیں دوسری عورتوں کا مذاق اڑائیں، شاید کہ وہ ان سے بہتر ہوں۔ اور نہ آپس میں ایک دوسرے کو عیب لگاؤ، اور نہ ایک دوسرے کو برا لقب دو۔ ایمان کے بعد گناہ کا نام لگنا برا ہے۔ اور جو شخص توبہ نہ کرے تو وہی لوگ ظالم ہیں۔

ولا تنابزوا بالالقاب کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے کس چیز سے منع فرمایا ہے، اس کے سلسلہ میں ہم تفسیر طبری کے الفاظ نقل کرتے ہیں:

(ولا تنابزوا بالالقاب) نھی ان یدعی الرجل باسم یکرھہ او صفۃ (بئس الاسم الفسوق بعد الایمان) من سخر من المومنین و نبزھم بالالقاب وخالف امر اللہ عزوجل فقد استحق اسم الفسق (طبری)

ان الفاظ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے اس سے روکا ہے کہ کسی آدمی کو ایسے نام سے پکارا جائے جس کو وہ پسند نہ کرے یا ایسی صفت سے جو اس کو پسند نہ ہو۔ جو مسلمان کسی شخص کا مذاق اڑائے اور اس کو برا لقب دے اور اللہ کے حکم کی خلاف ورزی کرے تو وہ فسق کے گناہ کا مستحق ہو گیا۔

ایک شخص سے آپ کو اختلاف ہو جائے تو ایک صورت یہ ہے کہ آپ اس کو اس کے اصل نام سے پکاریں اور اس کی اس صفت پر اظہار خیال کریں جو اس کی معروف صفت ہے، اگر آپ ایسا کریں تو ایسا کرنا آپ کے لیے جائز ہے۔ اس کے برعکس اگر آپ اس کو ایک نیا نام دیں، مثلاً عبدالوہاب کے بجائے اس کو وہابڑا کہیں تو یہ ایک غیر اسلامی فعل ہے۔ اسی طرح اگر آپ اس کے مسلک کو اس کے ظاہر کیے ہوئے لفظوں میں بیان کرنے کے بجائے کچھ دوسرے الفاظ میں بیان کریں، مثلاً یہ کہیں کہ یہ کافروں کا ایجنٹ ہے، تو یہ سراسر فاسقانہ حرکت ہے اور اللہ تعالیٰ کے غضب کو بھڑکانے والی ہے۔

اس آیت میں جس چیز سے منع کیا گیا ہے، اس کا تلخ تجربہ ہم کو ماہنامہ الرسالہ کے سلسلہ میں ہوا۔ الرسالہ میں اسلام کے جن پہلوؤں کو نمایاں کیا جارہا ہے ان میں سے ایک وہ ہے جس کا تعلق تعمیر ملت سے ہے۔ الرسالہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کو تلقین کرتا ہے کہ وہ قرآن کے حکم کے مطابق صبر اور اعراض کا طریقہ اختیار کریں۔ اس بات سے برہم ہو کر کچھ لوگ کہہ رہے ہیں کہ الرسالہ مسلم دشمنوں کا ایجنٹ ہے، وہ مسلمانوں کو بزدلی سکھا رہا ہے، وغیرہ۔

اس طرح کے تبصرے، مذکورہ آیت کے مطابق، بلاشبہ فسق ہیں۔ یہ ہم کو وہ نام دینا ہے جو ہم نے اپنا نام نہیں رکھا، اور ہماری طرف وہ الفاظ منسوب کرنا ہے جو ہم نے اپنی زبان سے ادا نہیں کیا۔ لوگوں کو اگر کہنا ہے تو یہ کہیں کہ الرسالہ صبر اور اعراض کی پالیسی پر عمل کرنے کا سبق دیتا ہے اور ہم فلاں شرعی یا علمی دلیل کی بنا پر اس کو رد کرتے ہیں۔ انھیں جو کچھ بولنا ہے "صبر اور اعراض" پر بولیں نہ کہ "بزدلی" یا کسی اور نام پر جو انھوں نے خود سے گھڑ کر ہمارے اوپر چسپاں کر دیا ہو۔ ہم نے جو کہا ہے وہ یہ ہے کہ "مسلمان صبر کریں"۔ ہم نے یہ نہیں کہا کہ "مسلمان بزدل بنیں"۔ ایسی حالت میں جو شخص ہمارے اوپر وہ لفظ چسپاں کرتا ہے جو ہم نے نہیں کہا تو اس کو جاننا چاہیے کہ اس کے اوپر قرآن کی مذکورہ آیت چسپاں ہو رہی ہے، خواہ وہ چاہے یا نہ چاہے۔

مذکورہ آیت میں مزید یہ فرمایا گیا ہے کہ دوسرے شخص کو برا کہنے والا اگر توبہ نہ کرے تو اللہ کے یہاں وہ خود ظالم قرار پائے گا۔ یہی بات حدیث میں مختلف الفاظ میں آئی ہے۔ یہاں ہم چند روایتیں نقل کرتے ہیں:

عن ابی ذر قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لایرمی رجل رجلاً بالفسوق ولایرمیہ بالکفر الا ارتدت علیہ ان لم یکن صاحبہ کذالک (رواہ البخاری) وعن ابن عمر قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایما رجل قال لاخیہ کافر فقد باء بہا احدھما (متفق علیہ) وعن ابی ذر قال قال رسول اللہ صلی اللہ

حضرت ابوذر کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب ایک شخص دوسرے شخص کو فسق یا کفر کا الزام لگائے تو یہ الزام ضرور کہنے والے پر لوٹے گا اگر اس کا ساتھی ایسا نہ ہو۔ حضرت عبداللہ بن عمر کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص بھی اپنے بھائی کو کافر کہے تو وہ ضرور دونوں میں سے ایک پر پڑے گا۔ حضرت ابوذر کہتے

علیہ وسلم من دعیٰ رجلاً بالکفر او قال عدو اللہ ولیس ذالک الا حاء علیہ (متفق علیہ)

ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص دوسرے شخص کو کافر کہہ کر پکارے یا اس کو خدا کا دشمن کہے اور وہ ایسا نہ ہو تو یہ بات خود کہنے والے پر لوٹ آئے گی۔

ان احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی کو برا نام دینا بے حد سنگین جرم ہے۔ اور اس کی سنگینی کا سب سے زیادہ نازک پہلو یہ ہے کہ جس شخص کو برا نام دیا گیا ہے، اگر وہ ایسا نہیں ہے تو اس برے نام کا سارا وبال خود کہنے والے کی طرف لوٹ آئے گا۔ شریعت اسلام نے اس سے کسی کو نہیں روکا کہ وہ حقائق و واقعات کی بنیاد پر کسی کے خیالات کا تجزیہ کرے جس کو موجودہ زمانہ میں علمی تنقید کہا جاتا ہے۔ مگر کسی کو برا نام دینا (کسی کے بارہ میں مخالفانہ ریمارک پاس کرنا) سراسر غیر شرعی فعل ہے۔ یہ اللہ کو اتنا زیادہ ناپسند ہے کہ اگر مخاطب ویسا نہ ہو تو یہ برا نام خدا کے رجسٹر میں خود قائل کے خانہ میں لکھ دیا جاتا ہے۔ گویا یہ ایک قسم کا بوم رینگ (Boomerang) عمل ہے۔ یہ ایک ایسا پتھر ہے جو دوسرے پر نہ پڑے تو وہ لوٹ کر خود پھینکنے والے پر پڑتا ہے۔

مولانا شبیر احمد عثمانی نے اس آیت کی تفسیر کے تحت لکھا ہے: "عموماً دیکھا جاتا ہے کہ جہاں دو شخصوں یا دو جماعتوں میں اختلاف رونما ہوا، بس ایک دوسرے کا تمسخر اور استہزار کرنے لگتا ہے۔ ذرا سی بات ہاتھ لگ گئی اور ہنسی مذاق اڑانا شروع کر دیا۔ حالاں کہ اسے معلوم نہیں کہ شاید جس کا مذاق اڑا رہا ہے وہ اللہ کے نزدیک اس سے بہتر ہو۔ بلکہ بسا اوقات یہ خود بھی اختلاف سے پہلے اس کو بہتر سمجھتا ہوتا ہے مگر ضد اور نفسانیت میں دوسرے کی آنکھ کا تنکا نظر آتا ہے، اپنی آنکھ کا شہتیر نظر نہیں آتا۔ آیۂ ہذا میں خداوند قدوس نے اس قسم کی باتوں سے منع فرمایا ہے۔ یعنی ایک جماعت دوسری جماعت کے ساتھ نہ مسخراپن کرے نہ ایک دوسرے پر آوازے کسے جائیں، نہ کھوج لگا کر عیب نکالے جائیں اور نہ برے ناموں اور برے القاب سے فریق مقابل کو یاد کیا جائے۔ کسی کا برا نام ڈالنے سے آدمی خود گنہ گار ہوتا ہے۔ اُسے تو واقع میں عیب لگایا نہ لگا، لیکن اس کا نام بدتہذیب، فاسق، گنہ گار، مردم آزار پڑ گیا۔ جو پہلے ہو چکا اب توبہ کر لو۔ اگر یہ احکام و ہدایات سننے کے بعد بھی ان جرائم سے توبہ نہ کی تو اللہ کے نزدیک اصلی ظالم یہ ہی ہوں گے۔"

خواب پورا ہو گیا

قرآن کو گہرائی کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کے دوران میں نے تقریباً تمام قابل ذکر تفسیروں سے استفادہ کیا اور اس طرح مجھے ان کی نوعیت سے واقف ہونے کا موقع ملا۔ قدیم وجدید تفسیروں کو دیکھنے کے بعد میرا احساس یہ تھا کہ قرآن کے اکثر پہلوؤں پر اگرچہ بڑی بڑی تفسیریں لکھی جا چکی ہیں، تاہم اس کا ایک پہلو ایسا ہے جو ابھی تک باقی پڑا ہوا ہے۔ اور عجیب بات ہے کہ یہ عین وہی پہلو ہے جو قرآن کے بیان (القمر ۱۷) کے مطابق اس کا اصل پہلو ہے، اور جس کے لیے اصلاً قرآن اتارا گیا، یعنی تذکیر و نصیحت۔ لوگوں نے بے شمار تفسیریں لکھیں، مگر خالص تذکیری انداز میں ابھی تک کوئی تفسیر نہیں لکھی گئی۔

جب میں یہ کہتا ہوں کہ تذکیری نوعیت کی کوئی تفسیر نہیں لکھی گئی تو اس سے میری مراد دو چیزیں ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ آیات کے ان پہلوؤں کو ابھارنا جو اپنے اندر انسان کے لیے کوئی سبق رکھتے ہیں اور جو قلبی اور عقلی اعتبار سے اس کو ازیادایمان کی طرف لے جانے والے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس اعتبار سے موجودہ تفسیریں، اپنی ساری عظمت کے باوجود، ایک قسم کا پردہ بن گئی ہیں۔ ایک شخص قرآن کا متن یا اس کا صرف ترجمہ پڑھے تو وہ حسب استعداد اس سے تذکیری غذا لے سکتا ہے۔ مگر جب وہ موجودہ تفسیروں میں سے کوئی تفسیر پڑھتا ہے تو دوسرے دوسرے مباحث میں وہ اتنا گم ہوتا ہے کہ ملنے والی چیز بھی اس کو نہیں ملتی۔

دوسری چیز وہ ہے جس کا تعلق اسلوب بیان سے ہے۔ موجودہ تفسیریں اکثر خاص طرح کے فنی اسلوب میں لکھی گئی ہیں۔ یہ فنی اسلوب تذکیر و موعظت کے لیے سراسر غیر موزوں ہے۔ اور جو اسلوب تذکیر و موعظت کے لیے موزوں ہے اس کے مطابق میرے علم کی حد تک کسی نے قرآن کی تفسیر نہیں لکھی۔

یہ بات تفسیروں کے مطالعہ کے دوران میرے علم میں آچکی تھی۔ مگر مجھے ہرگز یہ معلوم نہ تھا کہ قرآن کی خدمت کا یہ کام خود مجھ سے لیا جائے گا۔

۱۹۶۳ کا واقعہ ہے۔ اس وقت میں اعظم گڈھ میں تھا۔ یہ میری زندگی کا خاص وقفہ تھا جب کہ مجھ پر ایک قسم کی حیرانگی کا عالم طاری تھا۔ اس وقت میں ایک ناپیدا کنار صحرا کے کنارے کھڑا ہوا تھا۔ میں خدمت دین کی تڑپ سے جل رہا تھا۔ مگر کام کے عملی مواقع مجھے دکھائی نہیں دیتے تھے۔ حتی کہ مجھ پر یہ

بھی واضح نہ تھا کہ آئندہ مجھے واقعۃً کوئی کام کرنا ہے یا محض کام کی تڑپ لے کر مرجانا ہے۔ عین اسی نفسیاتی حالت میں یکم فروری ۱۹۶۳ کو اعظم گڈھ کے ایک دیہات میں میں نے خواب دیکھا۔ اٹھا تو پورا خواب یاد نہیں رہ گیا تھا۔ صرف خواب کا ایک جزء ذہن میں باقی تھا۔ اور وہ تھا ——— "۱۹ جولائی" بیداری کے بعد مجھے یہ تاریخ (۱۹ جولائی) تو اچھی طرح یاد تھی، مگر اصل خواب کچھ بھی یاد نہ تھا۔

۱۹۶۳ کے اس خواب کے مطابق میں ہر سال "۱۹ جولائی" کا انتظار کرتا رہا ہوں۔ یہ بات میرے گھر کے تمام افراد کو معلوم ہے۔ مگر ہر سال یہی ہوا کہ جب ۱۹ جولائی آئی تو اس روز کوئی ایسا قابل ذکر واقعہ پیش نہیں آیا جس کو اس خواب کی تعبیر سمجھا جاسکے۔ اسی طرح ۲۳ سال بیت گیے۔ ۱۹۸۶ کی ۱۹ جولائی وہ پہلی تاریخ ہے جب کہ ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس کو میں اپنی پوری زندگی کا سب سے زیادہ یادگار واقعہ سمجھتا ہوں۔ اور وہ یہ کہ عین اسی تاریخ کو میری تفسیر کی کتاب مکمل ہوئی۔ اسی روز میں نے تذکیر القرآن کا آخری صفحہ لکھا۔

۱۹۶۳ کے بعد مجھ پر مختلف حالات پیش آتے رہے۔ یہاں تک کہ ۱۹۶۷ میں میں دہلی منتقل ہوا اور پھر ۱۹۷۶ سے ماہنامہ الرسالہ نکلنا شروع ہوا۔ ماہنامہ کی وجہ سے مزید تحریک ہوئی اور میں نے ۱۹۷۹ سے باقاعدہ طور پر تذکیر القرآن لکھنا شروع کر دیا۔ اس دوران سخت ناموافق حالات کے باوجود تذکیر القرآن کی تحریر کا کام برابر جاری رہا۔ اور پھر مذکورہ خواب کے ۲۳ سال بعد "۱۹ جولائی" کو وہ تکمیل تک پہونچا۔

میں جب اس پورے واقعہ پر غور کرتا ہوں تو مجھے اس میں ذرا بھی شبہ نہیں ہوتا کہ میرے مذکورہ خواب کی تعبیر یہی تذکیر القرآن ہے۔ "۱۹ جولائی" اس کی تکمیل کی وہ تاریخ تھی جو خود اللہ تعالیٰ نے ۲۳ سال پہلے اپنی طرف سے مقرر فرما دی تھی۔ یہاں میں وہ الفاظ نقل کرتا ہوں جو میں نے تفسیر کی تکمیل کے بعد اپنی ڈائری میں لکھے تھے:

"آج جولائی ۱۹۸۶ کی ۱۹ تاریخ ہے۔ اور صبح ۴ بجے کا وقت۔ میں ابھی تذکیر القرآن کا آخری صفحہ (تفسیر سورۃ الناس) لکھ کر فارغ ہوا ہوں۔ تذکیر القرآن لکھنے کا کام ۱۹۷۹ کے وسط میں شروع ہوا تھا۔ اور اس کی پہلی قسط ماہنامہ الرسالہ اگست ۱۹۷۹ میں شائع ہوئی تھی۔ آج ۱۹ جولائی ۱۹۸۶ کو اس کی تحریر کا کام آخری طور پر مکمل ہوا۔ اس طرح اس کے لکھنے میں پورے سات سال لگ گیے۔ آج صبح

۳ بجے اٹھ کر میں تذکیر القرآن (سورۃ الناس) لکھنے بیٹھ گیا۔ اس کی آخری سطریں عین اس وقت پوری ہوئیں جب کہ نظام الدین کی مسجد سے فجر کی اذان کی آواز آرہی تھی۔

تذکیر القرآن کی تکمیل مجھے ایک خدائی معاملہ نظر آتی ہے۔ یہ میرے لیے اتنا زیادہ مشکل کام تھا کہ اس کا ہر صفحہ لکھنے کے بعد مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اب میں اس کا اگلا صفحہ نہ لکھ سکوں گا۔

یکم فروری ۱۹۶۳ کو جب کہ میں اعظم گڈھ میں تھا، میں نے ایک خواب دیکھا تھا۔ اٹھا تو پورا خواب یاد نہیں رہ گیا۔ صرف خواب کا ایک جزء "۱۹ جولائی" ذہن میں باقی تھا۔ بیداری کے بعد مجھے یاد نہ رہا کہ یہ کس بات کی تاریخ ہے۔ صرف اتنا یاد تھا کہ میں نے خواب میں ۱۹ جولائی کی تاریخ دیکھی ہے۔

۱۹۶۳ کے اس خواب کے بعد ہر سال میں ۱۹ جولائی کا انتظار کرتا رہا ہوں۔ مگر ہر سال یہی ہوا کہ جب ۱۹ جولائی آئی تو اس روز کوئی خاص نمایاں واقعہ پیش نہیں آیا۔ اسی طرح ۲۳ سال بیت گیے۔ ۱۹۸۶ کی ۱۹ جولائی وہ پہلی تاریخ ہے جب کہ ایک ایسا واقعہ پیش آیا جو شاید میری زندگی کا سب سے زیادہ قابل ذکر واقعہ ہے۔ اور وہ یہ کہ عین اسی تاریخ کو میں نے تذکیر القرآن کا آخری صفحہ لکھا۔

"۱۹ جولائی" کو تذکیر القرآن کا مکمل ہونا بڑا عجیب واقعہ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کام تمام تر خدا کی مدد سے ہوا۔ اور عین خدا کے منصوبہ کے تحت اپنی تکمیل کو پہونچا۔ یہ ایک خدائی منصوبہ تھا اور خدا ہی نے اپنے خصوصی اہتمام سے اس کو پورا کیا۔

تذکیر القرآن ایسے حالات میں مکمل ہوئی جب کہ میرے حالات بے حد خراب ہو چکے تھے۔ حتی کہ کچھ لوگ مجھے ہلاک کرنے کے درپے تھے۔ آج جب میں نے تذکیر القرآن کو مکمل کیا تو میرے دل نے کہا ——— جو کام مجھے کرنا تھا وہ کام آج پورا ہو گیا۔ اب انشاء اللہ خدا کے دین پر کوئی شخص پردہ نہ ڈال سکے گا، یہاں تک کہ قیامت آجائے۔"

ایک سفر

اگست ۱۹۸۶ کی بارہ تاریخ تھی۔ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ رسیور اٹھایا تو آواز آئی "میں بمبئی سے ایس بی کوپے بول رہا ہوں، کلیریٹی کا ایڈیٹر۔ ہم ۲۳ اگست کو بمبئی میں کمیونل ہارمنی کے اوپر ایک کانفرنس کر رہے ہیں۔ دہلی کی ملاقات میں میں نے اس کا ذکر کیا تھا۔ یہاں بہت سے لوگ اس ٹاپک پر آپ کے خیالات سننا چاہتے ہیں"۔ مختصر گفتگو کے بعد میں نے رضامندی دے دی۔ اگلے دن دونوں طرف سے "اوکے" ہوکر ٹکٹ آگیا۔ درمیان میں کانفرنس کے منتظمین کی طرف سے ہر بات کی اطلاع بذریعہ ٹیلی فون ملتی رہی۔ ۲۲ اگست کی شام کو میں انڈین ایر لائنز کی فلائٹ نمبر ۴۰۵ کے ذریعہ بمبئی پہونچا اور ۲۴ اگست کی صبح کو فلائٹ نمبر ۱۸۱ سے دہلی واپس آگیا۔ واضح ہو کہ دہلی سے بمبئی کا فاصلہ پندرہ سو کیلو میٹر ہے۔

یہ سب کچھ اس طرح ہوا جیسے میں گھر کے ایک کمرہ سے نکل کر دوسرے کمرہ میں جا رہا ہوں۔ اس طرح کے واقعات موجودہ زمانہ میں بے شمار لوگوں کے ساتھ پیش آرہے ہیں۔ ٹیلی فون، ہوائی جہاز، کمپیوٹر اور اس طرح کے دوسرے جدید آلات نے موجودہ زمانہ میں سفر اور مواصلات کو کتنا آسان بنا دیا ہے۔ یہ براہِ راست اللہ تعالیٰ کا انعام ہے۔ مگر مجھے اپنی واقفیت کے دائرہ میں ابھی تک وہ انسان نہیں ملا جو ان سہولتوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اللہ کی یاد میں گم ہو جائے۔ ان کو استعمال کرتے ہوئے خدا کے احسانات کا جذبہ اسے سرشار کر دے۔

انڈین ایر لائنز روزانہ ۲۴۰ سے زیادہ جہاز چلاتی ہے۔ یہ جہاز ۷۳ مقامات کو ایک دوسرے سے وابستہ کرتے ہیں۔ ان جہازوں پر روزانہ تقریباً ۲۶ ہزار مسافر ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتے ہیں۔ عالمی سطح پر ہوائی مسافروں کی تعداد اس سے بہت زیادہ ہے۔ میں نے اب تک ملک کے اندر اور ملک کے باہر تقریباً چالیس ہوائی سفر کیے ہیں۔ اور اگر آمد و رفت کو الگ الگ شمار کیا جائے تو ان سفروں کی تعداد ۸۰ تک پہونچ جائے گی۔ سفر کے دوران اور سفر کے بعد مجھے بے شمار لوگوں سے واقف ہونے کا موقع ملا۔ اس کے علاوہ بالواسطہ

طور پر بھی ان بہت سے لوگوں کے بارہ میں معلومات حاصل ہوئی ہیں جو جدید سہولتوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ مگر مجھے یاد نہیں کہ اب تک میں کسی ایسے شخص سے واقف ہوا ہوں جو حقیقی شعوری معرفت کے تحت ان چیزوں کو خدا کی نعمت سمجھتا ہو۔ رسمی طور پر الحمدللہ یا اس کے ہم معنی لفظ کہنے والے تو بہت ہیں۔ مگر اس انسان سے ابھی تک میں واقف نہ ہو سکا جو ان چیزوں کو دیکھ کر حمد خداوندی کے سمندر میں غرق ہو جائے۔ جو ان سے گزر کر اس طرح نکلے گویا وہ انعامات الٰہی کی بارش سے نہا کر نکلا ہے۔

ڈیڑھ گھنٹہ کی پرواز کے بعد جہاز جب بمبئی کے قریب پہونچا تو جھٹکے کے ساتھ وہ اس طرح اوپر سے نیچے آیا جیسے کوئی چیز اچانک بلندی سے گر پڑے۔ اس وقت زندگی اور موت ایک دوسرے سے قریب نظر آئے۔ انسان ہر لمحہ موت سے قریب ہے۔ تاہم خدا مختلف مواقع پر غیر معمولی جھٹکے دیتا رہتا ہے تاکہ جو لوگ شعور کی نگاہ سے نہ دیکھ سکتے ہوں وہ تجربہ کی نگاہ سے دیکھ لیں۔ جو لوگ سوچ کر حقیقتوں کو نہ جان سکتے ہوں وہ ان میں پڑ کر حقیقتوں کو جان لیں۔

بمبئی ہندستان کی تجارتی راجدھانی ہے۔ وہ دنیا کا ساتواں سب سے بڑا شہر ہے۔ اس کی موجودہ آبادی ایک کروڑ کے قریب ہے۔ وہ ہندستان کے قدیم ترین ساحلی شہروں میں سے ہے۔ یہاں مختلف حکومتیں رہی ہیں۔ ۱۳۴۸ء میں وہ گجرات کی مسلم سلطنت کے تحت آیا۔ سولھویں صدی کے آغاز میں پرتگالیوں نے اس پر قبضہ کیا۔ ۱۶۶۱ میں ایک معاہدہ کے تحت وہ برطانیہ کو مل گیا جس کا سلسلہ ۱۹۴۷ میں ختم ہوا۔

۱۸۵۷ میں یہاں سب سے پہلی کپڑے کی مل قائم ہوئی۔ بہت جلد بمبئی روئی کا ایک بڑا مارکیٹ بن گیا۔ ۶۵-۱۸۶۱ میں امریکہ میں زبردست خانہ جنگی ہوئی۔ اس کے نتیجہ میں امریکہ کی روئی کا برطانیہ پہونچنا بند ہو گیا۔ اب انگلینڈ کے کارخانوں نے اپنی ضرورت کی روئی بمبئی سے لینا شروع کیا۔ اس کے نتیجہ میں بمبئی کا روئی کا کاروبار بہت بڑھ گیا۔ ۱۸۶۹ میں نہر سوئز کا بحری راستہ کھلا تو یورپ اور بمبئی کے درمیان تجارت میں مزید ترقی ہوئی۔

بمبئی پورے معنوں میں میٹروپولیٹن شہر ہے۔ یہاں ہر مذہب کے لوگ موجود ہیں۔ تقریباً آدھی آبادی ہندوؤں پر مشتمل ہے۔ بقیہ میں مسلم، عیسائی، بدھ، جین، سکھ، پارسی اور یہودی

وغیرہ ہیں۔ اسی طرح یہاں ہندستان کی تمام زبانوں کے بولنے والے پائے جاتے ہیں۔ نیز غیر ملکی زبانوں کے بھی۔ تاہم مرہٹی زبان کو غلبہ حاصل ہے۔

بمبئی ٹائمز (The Bombay Times) غالباً ہندستان کا پہلا انگریزی اخبار ہے جو بمبئی سے جاری ہوا۔ یہ اخبار ۱۸۳۸ میں بمبئی ٹائمز کے نام سے جاری ہوا تھا، اب یہی اخبار ٹائمز آف انڈیا کے نام سے نکل رہا ہے۔ ٹائمز آف انڈیا کے سرورق پر لکھا رہتا ہے: جاری شدہ ۱۸۳۸۔ اس کا مطلب یہی ہے۔ کیوں کہ ۱۸۳۸ میں "ٹائمز آف انڈیا" نام کا اخبار موجود نہ تھا۔

میرا ایک خیال یہ ہے کہ کچھ چیزیں کسی خاص مقام کے لیے مقدر ہوتی ہیں اور وہ ٹھیک اسی مقام پر واقع ہوتی ہیں۔ بمبئی میں میں نے ایک خواب دیکھا۔ یہ بڑا عجیب خواب تھا۔ اور شاید یہی مقدر تھا کہ اس خواب کو میں بمبئی میں دیکھوں۔

بمبئی میں میرا قیام لینڈس اینڈ (Lands End) کے گیسٹ ہاؤس میں تھا۔ یہ عمارت مالابار ہل پر واقع ہے۔ یہاں ۲۲ اور ۲۳ اگست کی درمیانی رات کو میں نے ایک خواب دیکھا۔ خواب بہت صاف تھا۔ میں نے دیکھا کہ کچھ لوگ مجھے پھانسی دے کر مار ڈالنا چاہتے ہیں۔ انھوں نے مجھے لکڑی کی ایک میز کے اوپر کھڑا کیا۔ اوپر چھت کے ساتھ پھانسی کا پھندا لٹک رہا تھا۔ ان لوگوں نے پھانسی کا پھندا میرے گلے میں ڈال کر میز میرے قدموں کے نیچے سے ہٹا دی۔ میں پھانسی کی رسی کے ساتھ لٹک گیا اور اسی وقت مر گیا۔ اس عمل کے دوران مجھے ذرا بھی کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ میں نہ اس کو دیکھ کر گھبرایا اور نہ میں نے کوئی مزاحمت کی۔ اس سے بھی زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ پھانسی لگنے کے فوراً بعد میں وہاں دوبارہ زندہ موجود تھا۔

جب ان لوگوں نے دیکھا کہ میں دوبارہ زندہ ہو گیا ہوں تو انھوں نے پھر اسی طرح مجھ کو میز کے اوپر کھڑا کیا۔ اور مذکورہ طریقے سے دوبارہ مجھے پھانسی دی۔ اب بھی یہی ہوا کہ میں بلا تکلیف مر گیا۔ اور اس کے فوراً بعد دوبارہ پہلے کی طرح وہاں زندہ موجود تھا۔ اب ان لوگوں نے پھانسی کا یہی عمل میرے ساتھ تیسری بار کیا۔ مگر تیسری بار ایسا ہوا کہ جیسے ہی رسی میری گردن میں ڈالی گئی میری نیند کھل گئی۔ تیسری بار میں مرنے سے پہلے جاگ اٹھا۔

مجھے ایسا لگتا ہے کہ یہ خواب بُشریٰ من اللہ ہے اور اس کی تعبیر نہایت بامعنی ہے۔ یہ خواب ان معاندانہ کارروائیوں کی تمثیل ہے جو میرے ساتھ پہلے کی گئیں اور اب بھی کی جارہی ہیں۔ اس خواب میں مجھے اپنے مشن کے سلسلہ میں ماضی کی تصویر اور مستقبل کی بشارت نظر آتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ میرے دینی اور تعمیری مشن کو "پھانسی" دینا چاہتے ہیں وہ ماضی میں بھی ناکام ہوئے اور مستقبل میں وہ قطعی ناکام رہیں گے۔ انشاء اللہ العزیز۔

۲۳ اگست کو صبح ۱۰ بجے کانفرنس شروع ہوئی۔ کانفرنس کی کارروائی لطیفی ہال (صابو صدیق انجینیرنگ کالج) میں ہوئی۔ میں وہاں پہونچا تو دیکھا کہ اندر باہر ہر طرف وردی پوش لوگ کھڑے ہوئے ہیں۔ حتی کہ چھتوں پر بھی مسلح پولس کے لوگ دکھائی دے رہے تھے۔ اس کانفرنس کا افتتاح چیف منسٹر مہاراشٹر ایس بی چوہان کرنے والے تھے۔ اس کے علاوہ کئی مرکزی اور ریاستی وزیر ڈائس پر موجود تھے۔ سیکوریٹی کا غیر معمولی انتظام اسی لیے تھا۔

ہمارے لیڈر انگریزوں کے دور میں ۱۹۴۷ سے پہلے یہ کہتے تھے کہ "سیکوریٹی" بیرونی حکمرانوں کی ضرورت ہے۔ آزادی کے بعد جب عوام کے نمائندے ملک کے حکمراں ہوں گے تو ان کو پولس اور فوج کی حفاظت کی ضرورت نہ ہوگی۔ اس لیے ملک اس قسم کے غیر ضروری اخراجات سے بچ جائے گا۔ مگر آج سیکوریٹی پر پہلے سے کئی گنا زیادہ خرچ ہو رہا ہے۔ ایک پولس افسر نے کہا: "آج کل تو سمجھ لیجئے کہ کرائم ڈیٹیکشن کا کام بند ہے، ساری طاقت بس سیکوریٹی پر لگ رہی ہے"

کانفرنس میں وزیر اعظم راجیو گاندھی کا پیغام پڑھا گیا۔ انھوں نے اپنے پیغام میں کہا تھا کہ کمیونلزم (فرقہ پرستی) ہمارے ملک کے لیے سب سے بڑا خطرہ (Greatest danger) ہے۔ مختلف حضرات نے پرجوش تقریریں کیں۔ ایک صاحب نے کہا کہ اسی بمبئی سے اسی اگست کے مہینے میں ہم نے انڈیا چھوڑو (Quit India) کا نعرہ دیا تھا۔ اب اسی بمبئی سے ہم کو فرقہ واریت انڈیا چھوڑے (Communalism Quit India) کا نعرہ دینا ہے۔ اسی طرح دوسرے حضرات نے فرقہ پرستی اور تشدد کو سختی سے کنڈم کیا۔ اور کہا کہ موجودہ صورت حال اگر اسی طرح باقی رہتی ہے تو ملک تباہ ہو جائے گا۔

یہ باتیں کس حد تک سنجیدہ ذہن سے کہی گئیں، اس سے قطع نظر اہم بات یہ ہے کہ

THE CONFERENCE ON COMMUNALISM AND NATIONAL INTEGRATION

On Saturday, August 23, 1986

DR. ALMA LATIFI HALL,

Saboo Siddik College of Engineering
8, Shepherd Road, Nagpada, Byculla
Bombay - 400008.

PROGRAMME:

9-45 a.m. Introductory remarks by **S.B. KOLPE,** Chairman Steering Committee.
A minute's silence in memory of the late Gen. A.S. VAIDYA.

9-50 Song: "AAO HUM SABHI MILENGE" by **MRS. KAMALINI SHETTY.**

9-55 Conference theme by **DR. RASHMI MAYUR,** Conference Co-ordinator.

10-05 Welcome address, by **DR. ISHAQ JAMKHANAWALA,** President, Anjuman-I-Islam.
MESSAGES.

10-15 Address, **MR. S.B. CHAVAN,** Chief Minister of Maharashtra.

10-30 Inaugural Address—Chief Guest, **MR. ARJUN SINGH,** *Chief Vice-President,* AICC(I)
Special Guest: **MRS. MOHSINA KIDWAI,** Union Minister of Transport.

11-00 *Speeches:*
MR. H.N. BAHUGUNA,
Working President, Lok Dal.
MR. MURLI DEORA, President, BRCC(I)
MAULANA WAHIDDUDDIN KHAN, Islamic Scholar & Editor, Monthly *Al-Risala,* New Delhi.
DR. SIMON PIMENTA, Archbishop of Bombay.
RUSSY KARANJIA, Editor-in-Chief Blitz group of publications.

11-45 TEA BREAK

12-00 *Recitation:* "Deewar" by Prof. **C.M. WAGH,** Marathwada University.

12-05 **RESHAM SINGH,** President, Bombay Guru Singh Sabha.
MR. V.S. PAGE, Chairman Gandhi Smarak Nidhi, Bombay.
MR. GURMUKH SINGH NAGI, MR. RANJIT BHANU, President, Janata Party (Bombay Unit).
MR. L.S. KARKHANIS, Secretary, CPI (Maharashtra Unit).
MR. PRABHAKAR SANZGIRI, Leader, CPI (Marxist).

13-10 Conclusion of the morning Session, **MR. RANJAN BHATTACHARYA.**

13-15 LUNCH

14-30 to 16-30 PANEL DISCUSSIONS.

i) **MASS MEDIA AND COMMUNALISM:**

Chairman: Mr. **HARI JAISINGH,** Resident Editor, Indian Express.

Panelists: Mr. Achin Vanaik, Mr. Iqbal Masud, Mr. L.S. Herdenia, Shri Arun Gandhi, Shri Dinkar Sakrikar, Shri Vijay Tendulkar, Mrs. Vimla Patil, Shri S.B. Kolpe, Shri V. Veniyoor, Shri Prakash Kulkarni, Shri Binod Rao and Shri Khalish Jafri.

ii) **EDUCATION & NATIONAL INTEGRATION:**

Chairman: **DR. RASHMI MAYUR**

Panelists: Dr. K. Jagjit Singh, (Principal, Khalsa College) Mr. K. Hussain (Principal, Saboo Siddik College), Mr. M.G. Shah, President, ISCUS, Mr. Madhu Mehta, President, Hindustani Andolan, Dr. Anthony Sequira, President, Catholic Association of Bombay, Mr. Harshad Bhat, Senior Advocate, Shri K.M. Aarif and Mr. Bal Patil.

iii) **POLITICAL PROCESS OF INTEGRATION:**

Chairman: **DR. RAFIQ ZAKARIA**

Panelists: Dr. Rashpal Malhotra, Director, Centre for Research in Rural and Industrial Development.
Mr. Homi J.H. Talyarkhan.
Mr. Chandrashekhar Prabhu, M.L.A.
Mr. Y.P. Trivedi, Mr. S.M. Zaidi, Dr. Zoe Ansari, Mrs. Kamala Raman, Prof Nalini Pandit, (Sociologist), Mr. Asghar Ali Engineer and Mr. Vijay Kamble.

16.45 — **VALEDICTORY SESSION:**
MR. A.R. ANTULAY TO ADDRESS.

18.00 — A Special Meeting under the auspices of Al Risala Friends Circle and Clarity Friends Circle on Saturday August 23, 1986. **MAULANA WAHIDUDDIN KHAN,** editor of monthly *Al-Risala,* will address the meeting.

ORGANISERS:

- ☐ **AICC (I)—Minorities Cell**
- ☐ **Anjuman-I-Islam**
- ☐ **Chairman: Gandhi Smarak Nidhi**
- ☐ **Bombay Union of Journalists**
- ☐ **Jamiat-e-Ulema, Maharashtra**
- ☐ **Maharashtra—Punjab Ekta Forum**
- ☐ **Local Urdu Newspapers Association**
- ☐ **Catholic Association of Bombay**
- ☐ **Rama Ranjini Cultural Association**
- ☐ **Al-Risala Friends Circle, Bombay**
- ☐ **Blitz National Forum**
- ☐ **Bohra Youth Association**
- ☐ **International Buddhist Association.**
- ☐ **Jain Youth Association**
- ☐ **Urban Development Institute**
- ☐ **Clarity Friends Circle**

آج ہم ایک ایسے دور میں ہیں جب کہ فرقہ واریت، تشدد، امتیازی سلوک مسلّمہ طور پر بری چیزیں بن چکی ہیں۔ آج کوئی ان چیزوں کا وکیل نہیں۔ جب کہ ماضی میں معاملہ اس سے مختلف تھا۔ اگر ہم حکمت اور برداشت سے کام لیں تو یقینی طور پر ہم اس ملک میں باعزت زندگی حاصل کر سکتے ہیں۔

کانفرنس میں میری دو تقریریں ہوئیں۔ ایک کانفرنس کے درمیان۔ اور دوسری کانفرنس کے آخر میں۔ کانفرنس کے دوران ہر آدمی کو پندرہ منٹ دیا گیا۔ مجھے بھی پندرہ منٹ کا موقع ملا۔ مگر اس موضوع پر میرے خیالات سننے کے لیے شام کو ۶ بجے اسی ہال میں ایک خصوصی نشست رکھی گئی۔ یہ ایک گھنٹہ کی نشست تھی اور میں اس میں تنہا مقرر تھا۔ میں نے فرقہ واریت کے مسئلہ پر تفصیل کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ عام طور پر لوگوں نے اتفاق اور پسندیدگی کا اظہار کیا۔ سامعین میں ہندو اور مسلم دونوں صاحبان بڑی تعداد میں موجود تھے۔

کانفرنس کی زیادہ تر کارروائی انگریزی میں ہوئی۔ صرف چند تقریریں اردو میں ہوئیں۔

کانفرنس میں ڈائس پر میری کرسی سے ملی ہوئی کرسی پر ایک مرکزی وزیر بیٹھے ہوئے تھے۔ گفتگو کے دوران معلوم ہوا کہ وہ الرسالہ کے مستقل قاری ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ان کے گھر میں بھی الرسالہ پڑھا جاتا ہے۔ اسی طرح یہاں اور بہت سے لوگ ملے جن کے بارہ میں میرا گمان نہیں تھا کہ وہ الرسالہ سے باخبر ہوں گے۔ مگر گفتگو کے بعد معلوم ہوا کہ وہ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کے قاری ہیں۔ بلکہ ان میں ایسے بھی تھے جنھوں نے کہا کہ "ہم تو الرسالہ کے عاشق ہیں"۔ اللہ تعالیٰ نے الرسالہ کو عجیب مقبولیت عطا فرمائی ہے۔ وہ ایسی ایسی جگہوں پر پہونچ رہا ہے جہاں ہمارا گمان بھی نہیں جا سکتا تھا۔

کانفرنس کے درمیان پندرہ منٹ کی تقریر میں میں نے کہا کہ اگر مجھے جدید ہندستان کی تاریخ لکھنی ہو اور اس میں یہ بتانا ہو کہ جدید ہندستان کا سب سے انوکھا واقعہ کیا ہے، تو میں کہوں گا کہ یہاں کا سب سے زیادہ انوکھا واقعہ یہ ہے کہ جس ملک نے عدم تشدد کے ذریعہ آزادی حاصل کی وہ آزادی کے فوراً بعد تشدد کے راستہ پر چل پڑا۔

میں نے کہا کہ ہندستان میں آزادی کی تاریخ ۱۸۵۷ سے شروع ہوتی ہے۔ ۱۹۱۹ میں مہاتما گاندھی کے سیاست میں داخلہ تک یہ تحریک متشددانہ طریقہ پر چلتی رہی۔ مگر اسے کامیابی نہ

ہو سکی۔ گاندھی جی ہندستان کی سیاست میں داخل ہوئے تو انھوں نے آزادی کی تحریک کو عدم تشدد کے طریقہ پر چلانے کا فیصلہ کیا۔ اس زمانہ کا ایک دلچسپ لطیفہ ہے۔ جب مہاتما گاندھی نے تشدد کا ہتھیار ترک کر کے عدم تشدد کا طریقہ اختیار کیا تو ہندستان کے ایک انگریز کلکٹر نے اپنے سکریٹریٹ کو تار دیا :

Kindly wire instructions how to kill a tiger non-violently.

براہِ کرم بذریعہ تار مطلع فرمائیں کہ ایک شیر کو غیر متشددانہ طریقہ پر کیسے ہلاک کیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ مہاتما گاندھی نے تشدد کو ترک کر کے انگریز سے تشدد کا جواز چھین لیا۔ اس سے پہلے انگریز کا مسئلہ آسان تھا۔ وہ تشدد کے جواب میں تشدد کرتا تھا۔ مگر اب اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ عدم تشدد کے جواب میں کیوں کر تشدد کیا جائے۔ چنانچہ اسے ملک کو چھوڑ دینا پڑا۔

میں نے کہا کہ ملک کی یہ تاریخ بتاتی ہے کہ عدم تشدد کی طاقت تشدد سے زیادہ ہے۔ یہی موجودہ فرقہ واریت کا حل ہے۔ ہم کو چاہیے کہ سارے ملک میں یہ شعور بیدار کریں۔ جس دن لوگ اس راز کو جان لیں گے اسی دن تشدد بھی اس ملک سے ختم ہو جائے گا۔ نئی نسل کو ہندستان کی قدیم تاریخ کا یہ سبق یاد دلانا، یہی اس مسئلہ کا سب سے زیادہ کامیاب حل ہے۔

میں نے کہا کہ اس وقت ہندستان میں اسی قسم کی ایک تحریک کی ضرورت ہے جس کو جاپان نے برعکس عمل (Reverse course) کا نام دیا ہے۔ جاپان دوسری جنگ عظیم تک تشدد کے طریقہ پر چل رہا تھا۔ جنگ میں شکست کے بعد اس نے اپنے رخ کو بدل کر غیر متشددانہ راستہ میں آگے بڑھنا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ ۴۰ سال میں ملک کی تاریخ بدل گئی۔

چارلس ڈیگال نے یہی ریورس کورس کا طریقہ فرانس میں اختیار کیا۔ فرانس اپنے افریقہ کے مقبوضات میں آزادی کی تحریک کو تشدد سے دبا رہا تھا۔ ڈیگال اقتدار میں آئے تو انھوں نے محسوس کیا کہ افریقہ میں آزادی کی تحریک کو دبانے میں فرانس اتنی زیادہ طاقت خرچ کر رہا ہے کہ وہ نیوکلیر سائنس میں پیچھے ہو گیا ہے۔ ڈیگال نے یک طرفہ طور پر اپنے افریقی مقبوضات کو آزاد کر دیا۔ اس کا نقد نتیجہ اس کو یہ ملا کہ فرانس نے دوبارہ یورپ میں نمبر ایک طاقت کی حیثیت حاصل کر لی۔ مہاتما گاندھی نے اسی ریورس کورس کو ہندستان کے حالات کے اعتبار سے

اختیار کیا اور برطانیہ کو شکست دینے میں کامیابی حاصل کی۔

میں نے کہا کہ "ریورس کورس" کا یہ کامیاب طریقہ دنیا کو پیغمبر اسلام کی دین ہے۔ معلوم تاریخ میں پیغمبر اسلام پہلی نمایاں شخصیت ہیں جنھوں نے اس طریقہ کو استعمال کر کے دنیا کے لیے کامیابی کا راستہ کھولا۔ صلح حدیبیہ عرب کے حالات کے لحاظ سے عین وہی چیز تھی جس کو جاپانیوں نے موجودہ زمانہ میں ریورس کورس کا نام دیا ہے۔ پیغمبر اسلامؐ اس طریق عمل کے موجد ہیں۔ موجودہ دنیا میں سب سے زیادہ مشکل کسی چیز کو دریافت کرنا ہے، اور جب وہ چیز دریافت ہو جائے تو اس کی نقل ہر ایک کے لیے آسان ہو جاتی ہے۔

آج دوبارہ ہندستان میں ایک ریورس کورس کی ضرورت ہے۔ نفرت کے بجائے محبت، تشدد کے بجائے عدم تشدد، بدگمانی کے بجائے نیک گمان، ٹکراؤ کے بجائے پرامن تعمیر، جس دن ملک میں اس ریورس کورس کا آغاز ہوگا اسی دن یہ ملک دوبارہ کامیابی کی منزل کی طرف چل پڑے گا جو آج راستہ بھول کر منزل سے بہت دور نکل گیا ہے۔ جو فرقہ سب سے پہلے ریورس کورس کا طریقہ اختیار کرے گا وہ دوسرے فرقوں پر بازی لے جائے گا۔

۲۳ اگست کی شام کو جناب ڈاکٹر ٹانک صاحب کی رہائش گاہ پر کھانا تھا۔ وہاں پہونچا تو اخبار بلٹز کی پارٹی انٹرویو لینے کے لیے موجود تھی۔ پہلے زمانہ میں انٹرویو لینے والے کو یہ کرنا پڑتا تھا کہ وہ ایک طرف سوال کرے اور دوسری طرف وہ جواب دینے والے شخص کی بات کو جلدی جلدی کاغذ پر لکھتا رہے۔ اب ٹیپ ریکارڈر نے اس کام کو بہت آسان بنا دیا ہے۔ چنانچہ بلٹز کے نمائندے ایک طرف کرسیوں پر بیٹھ گیے۔ دوسری طرف میں بیٹھا ہوا تھا اور درمیان میں ایک چھوٹی سی میز پر ٹیپ ریکارڈر رکھا ہوا تھا۔ ہم لوگ ایک گھنٹہ تک باتیں کرتے رہے اور ہماری باتوں کو محفوظ کرنے کا کام ٹیپ ریکارڈر خاموشی کے ساتھ انجام دیتا رہا۔ اللہ تعالیٰ کی کیسی کیسی نعمتیں ہیں جو اس نے اپنے بندوں کے لیے کھولی ہیں مگر بہت کم لوگ ہیں جو اس کا شکر ادا کرتے ہوں۔ شاید اسی لیے قرآن میں آیا ہے: وقلیل من عبادی الشکور۔

انٹرویو کے سلسلہ میں میرا تجربہ یہ ہے کہ جو لوگ اپنے کو "اسلامی" کہتے ہیں وہ اکثر انٹرویو لیتے ہوئے "غیر اسلامی" بن جاتے ہیں۔ اس کے برعکس وہ لوگ جو سیکولر کہے جاتے ہیں،

ان کا انٹرویو لینے کا طریقہ زیادہ معقول ہوتا ہے۔

ان اسلامی حضرات کا معاملہ یہ ہے کہ وہ انسانوں کو دو الگ الگ خانے میں بانٹے ہوئے ہیں۔ ایک موافق اور دوسرے مخالف۔ یا اپنے گروہ کے لوگ۔ اور اپنے گروہ سے باہر کے لوگ۔ جن لوگوں کو وہ اپنے گروہ کا آدمی سمجھتے ہیں ان کا انٹرویو لینا ہو تو وہ اس کو معتدل انداز میں لیتے ہیں۔ مگر جس کو وہ اپنا مخالف یا اپنے گروہ سے باہر کا سمجھ لیں اس کا انٹرویو لیتے ہوئے وہ اعتدال کو کھو دیتے ہیں۔

مگر "سیکولر" لوگوں کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ ان کے ذہن میں انسانوں کی مندرجہ بالا تقسیم نہیں ہوتی یا کم از کم یہ کہ اس معاملہ میں وہ شدید نہیں ہوتے۔ اس لیے کسی بھی شخص کا انٹرویو لیتے ہوئے وہ اپنے اعتدال کو برقرار رکھنے میں کامیاب رہتے ہیں۔ بلٹز اسی دوسری قسم کے اخبارات میں سے ہے۔ چنانچہ اس کے نمائندوں سے انٹرویو نہایت خوش گوار فضا میں ہوا۔ ان لوگوں نے معتدل انداز میں سوالات کیے اور میں بھی آخر تک معتدل انداز میں ان کے سوالات کا جواب دیتا رہا۔

آخر میں انھوں نے کہا کہ آپ مسلمانوں کے بارہ میں جو رائے رکھتے ہیں اس کا خلاصہ بتائیے۔ میں نے کہا: "مسلمانوں نے برداشت کو کھو دیا ہے، اس لیے وہ ہر چیز کو کھوئے ہوئے ہیں۔ جس دن وہ جان لیں گے کہ برداشت زندگی کا راز ہے اسی دن دوبارہ وہ ان تمام چیزوں کو پالیں گے جس کو انھوں نے موجودہ زمانہ میں کھویا ہے۔"

بمبئی کا قیام اگرچہ بہت مختصر تھا۔ تاہم یہاں بہت سے لوگوں سے ملاقات کا موقع ملا۔ اکثر ملاقاتوں میں گفتگو کا موضوع ہندستانی مسلمانوں کی موجودہ صورت حال تھی۔ بعض مجالس میں گفتگو کے دوران میں نے کہا کہ ہندستان کے مسلمان ہمیشہ دوسروں کی شکایت کرتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں ہر آدمی صرف اپنے کیے کو بھگتتا ہے۔ ہندستان کے مسلمانوں کی مصیبت بھی حقیقۃً کسی ظالم کا ظلم نہیں، وہ مسلمانوں کے اپنے پچھڑے پن کی قیمت ہے۔

میں نے کہا کہ اس کی ایک مثال مسلمانوں کی موجودہ اردو صحافت ہے۔ یہ صحافت عام طور پر اتنی گھٹیا ہے کہ جدید معیار کے مطابق اس کو صحافت کہنا ہی مشکل ہے۔ اس سے بھی زیادہ افسوسناک

بات یہ ہے کہ اپنے مواد کے اعتبار سے اردو صحافت وہ مریض صحافت بن کر رہ گئی ہے جس کو انگریزی میں ایلو جرنلزم (Yellow journalism) کہا جاتا ہے۔ ایلو جرنلزم کی اصطلاح امریکہ میں انیسویں صدی کے آخر میں پیدا ہوئی۔ اس سے مراد سنسنی خیزی کی صحافت ہے۔ اس قسم کی صحافت امریکہ وغیرہ میں بہت عرصہ پہلے ختم ہو گئی۔ مگر ہندستانی مسلمانوں کے پچھڑے پن کا یہ نتیجہ ہے کہ ہمارے اکثر اردو اخبارات میں آج بھی وہ اپنی بدترین شکل میں جاری ہے۔

مسلمانوں کے درمیان اس مریض صحافت کے پھیلنے کا راز کیا ہے۔ اس سلسلہ میں میں نے کہا کہ اس کا راز مسلمانوں کی تعلیمی اور صنعتی پس ماندگی ہے۔ صحافت کو جو چیز غذا پہونچاتی ہے وہ انڈسٹری ہے اور مسلمان اس ملک کی انڈسٹری میں ایک فی صد بھی حصہ دار نہیں۔ صنعتی کارخانے بڑے پیمانہ پر عوام کی ضرورت کا سامان تیار کرتے ہیں۔ انھیں ضرورت ہوتی ہے کہ وہ اپنی صنعتی پیداوار سے عوام کو باخبر کریں۔ اس ضرورت نے صنعتی اشتہار کو وجود دیا ہے۔ یہ صنعتی اشتہار ہی دراصل جدید صحافت کی غذا ہیں۔ مسلمانوں کے پاس چوں کہ صنعت نہیں اس لیے ان کے اخبارات کے لیے اس غذا کا سامان بھی نہیں۔

یہی کمی ہے جس کی تلافی کے لیے مسلمانوں میں وہ چیز وجود میں آئی ہے جس کو میں مریض صحافت کہتا ہوں۔ یعنی سنسنی خیز خبریں اور جذباتی مضامین چھاپ کر لوگوں کو بھڑکانا تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں اخبار خریں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ صنعتی اشتہار سے محرومی نے اردو صحافت کو ایلو جرنلزم کا نمونہ بنا دیا ہے۔ جو لوگ اپنے جیبوں میں ڈاکٹری اور انجینیرنگ کی اعلیٰ ڈگریاں لیے ہوئے ہوں انھیں دادا بننے کی ضرورت نہیں۔ دادا گیری کا پیشہ ہمیشہ وہ لوگ اختیار کرتے ہیں جو اپنی غفلت کے نتیجہ میں جاہل رہ گیے ہوں۔ المیہ کی یہی وہ قسم ہے جس نے ہماری اردو صحافت کو موجودہ زمانہ میں مریض صحافت بنا کر رکھ دیا ہے۔

مجھے ایک بار ایک اردو اخبار کے دفتر میں جانے کا اتفاق ہوا۔ ادارتی اسٹاف سے ملاقات ہوئی۔ گفتگو کے دوران ان کی لیاقت کا جو اندازہ ہوا اس سے مجھے سخت مایوسی ہوئی۔ ادارہ کے ایک صاحب سے میں نے کہا کہ جرنلزم کی ایک قسم ہے جس کو ایلو جرنلزم (Yellow journalism) کہا جاتا ہے۔ کیا آپ بتائیں گے کہ یہ اصطلاح کیسے بنی اور اس کی ابتدائی تاریخ کیا ہے۔ وہ

خاموشی کے ساتھ میرا منہ دیکھتے رہے۔ مزید تحقیق کے بعد معلوم ہوا کہ اخبار کے اسٹاف میں سے کوئی ایک شخص بھی باضابطہ طور پر تربیت یافتہ نہیں۔ ان میں کوئی ایک شخص بھی ایسا نہ تھا جس نے کسی شعبہ فن میں اعلیٰ تعلیمی ڈگری حاصل کی ہو۔

ایک بار میری ملاقات چند حضرات سے ہوئی۔ تعارف کے بعد معلوم ہوا کہ وہ اردو صحافت سے تعلق رکھتے ہیں۔ گفتگو کے دوران میں نے ایک نوجوان سے کہا کہ صحافت کی ایک اصطلاح ہے جس کو الٹا اہرام (Inverted pyramid) کہا جاتا ہے۔ کیا آپ بتائیں گے کہ اس کا مطلب کیا ہے اور وہ کیا چیز ہے جس کو الٹا اہرام کا نام دیا گیا ہے۔ مگر وہ اس کی تشریح نہ کر سکے۔

پھر میں نے ایک اور صحافی سے کہا کہ امریکی تاریخ کا ایک واقعہ ہے جو اسپینی امریکی جنگ (Spanish-American war) کے نام سے مشہور ہے۔ یہ جنگ ۱۸۹۸ میں ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ اس جنگ کے چھڑنے میں ایلو پریس (Yellow Press) کا بہت بڑا دخل تھا۔ کیا آپ اس کی کچھ تفصیل بتا سکتے ہیں کہ ایلو پریس نے کس طرح اس جنگ کو بھڑکایا۔ مذکورہ اردو صحافی اس کا کوئی جواب نہ دے سکے۔

ایک بار میں ایک اخبار کے دفتر میں گیا۔ یہ ایک مشہور اردو اخبار ہے۔ اس کے اڈیٹر سے ملاقات کے دوران میں نے پوچھا کہ آپ کے یہاں ریفرنس بکس (Reference books) کے طور پر کون کون سی کتابیں ہیں۔ معلوم ہوا کہ اس نوعیت کی کوئی ایک بھی قابل ذکر کتاب اخبار کے دفتر میں موجود نہیں۔

بہت پہلے میں نے ادبی تنقید پر ایک مضمون لکھا تھا۔ یہ مضمون جناب نیاز فتح پوری کے نگار (جون ۱۹۴۵) میں چھپا تھا۔ نیاز فتح پوری نے مضمون شائع کیا تو انھوں نے اس کا عنوان بدل دیا۔ مجھے ان کا عنوان پسند نہ آیا۔ میں نے انھیں لکھا کہ آپ نے میرے مضمون میں تحریف کر دی۔ انھوں نے جواب میں لکھا: "میں نے جو کچھ کیا وہ تحریف نہیں بلکہ تصحیف تھی، جس کا ہر اڈیٹر مجاز ہوتا ہے۔" نیاز فتح پوری نے غالباً صحافت کے لفظ پر قیاس کرتے ہوئے یہاں تصحیف کو اڈیٹنگ (Editing) کے معنی میں استعمال کیا تھا۔ حالاں کہ عربی داں حضرات یہ جانتے ہیں کہ تصحیف کے یہ معنی نہیں ہیں۔ ایک اردو صحافی سے میں نے کہا کہ آپ یقیناً جانتے

ہوں گے کہ صحافت کو موجودہ زمانہ میں فورتھ اسٹیٹ کہا جاتا ہے۔ انھوں نے کہا ہاں۔ اس کے بعد میں نے ان کے سامنے ایک کاغذ بڑھاتے ہوئے گزارش کی کہ اس لفظ کو آپ اس کاغذ پر انگریزی میں لکھیں۔ انھوں نے کاغذ پر لکھا :

Fourth State

مگر جاننے والے جانتے ہیں کہ یہ درست نہیں۔

اگرچہ سب کا نہیں مگر اکثر اخباروں کا معاملہ یہی ہے۔ مسلمانوں کے اکثر اردو اخبارات کا حال یہ ہے کہ اس کا اسٹاف زیادہ تر نیم خواندہ اور غیر تربیت یافتہ افراد پر مشتمل ہوتا ہے۔ سنسنی خیز صحافت میں بھی وہ زیادہ اعلیٰ اور زیادہ لطیف معیار پیش کرنے پر قادر نہیں۔ بین اقوامی جاسوسی، اعلیٰ سطح کے سیاسی اسکینڈل اور بڑے بڑے صنعت کاروں کے اندرونی راز تک رسائی کے لیے جو اعلیٰ استعداد درکار ہے اس سے وہ خالی ہوتے ہیں۔ اپنی کم تر صلاحیت کی بنا پر وہ صرف سطحی قسم کی سنسنی خیز صحافت وجود میں لا سکتے ہیں اور اسی کو وہ وجود میں لاتے ہیں۔ وہ اپنی بے استعدادی کو اپنی قوم کے اوپر انڈیل دیتے ہیں۔

حال میں میں نے ایک مسلم اخبار کو دیکھا۔ اس کی یہ اشاعت وسط اگست ۱۹۸۶ میں عید اضحیٰ نمبر کے طور پر شائع کی گئی ہے۔ اس کے ٹائٹل پر انسانی لاشوں کی تصویریں چھپی ہوئی ہیں۔ یہ لاشیں ان مسلمانوں کی ہیں جو احمد آباد کے فساد (۹ جولائی ۱۹۸۶) میں جلائے یا قتل کیے گیے تھے یہ تصویر بلاشبہ دردناک ہے۔ مگر قابل ذکر بات یہ ہے کہ اخبار کے اندر کے صفحات تو معمولی کاغذ پر صرف کالے حروف میں چھپے ہوئے ہیں۔ مگر ان جلی اور کٹی ہوئی لاشوں کو آرٹ پیپر پر چار رنگ میں نمایاں کر کے چھاپا گیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اخبار کے ذمہ داروں کو کوئی بہت دل پسند چیز مل جائے اور اس کو وہ نہایت اہتمام کے ساتھ خوب رنگین بنا کر شائع کریں۔

لاشوں کو اس طرح چھاپنا لاشوں کو تجارت کا مال بنانا ہے۔ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ہمارے اکثر اخبارات فرقہ وارانہ فساد کے اوپر زندہ ہیں۔ اگر ہندستان میں فرقہ وارانہ فساد ختم ہو جائیں تو ان اخبارات کی زندگی کا سامان بھی ختم ہو جائے گا۔ کیسے عجیب ہوں گے وہ انسانی تاجر جن کی غذا جلے ہوئے جسم اور کٹی ہوئی لاشیں ہوں۔

مجھے ایک بار ایک مسلم کانفرنس میں شرکت کا اتفاق ہوا۔ اس میں مسلم اخبارات کے ایڈیٹر بھی بڑی تعداد میں شریک تھے۔ کانفرنس کا موضوع "تعمیر ملت" تھا۔ مگر میں نے دیکھا کہ جو شخص بھی اسٹیج پر آتا ہے وہ ایک دو منٹ کے بعد ہی "تعمیر" سے ہٹ کر "تخریب" کے موضوع پر بولنا شروع کر دیتا ہے۔ تعمیر ملت کے موضوع پر ہونے والی کانفرنس عملاً "دشمنانِ ملت" کے خلاف احتجاج کے ہم معنی بن گئی۔

یہی ہمارے اکثر اخبار نویسوں کا حال ہے۔ ان سے اگر کسی تعمیری موضوع پر لکھنے کے لیے کہئے تو ایسا محسوس ہوگا جیسے ان کے پاس تعمیری خیالات کو ادا کرنے کے لیے الفاظ ہی نہیں۔ مگر مسلم دشمنی اور ہندو فرقہ واریت پر لکھنا ہو تو ان کی فہرستِ الفاظ لامحدود حد تک وسیع ہو جاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندستان کے فرقہ وارانہ فسادات ہمارے اخبار نویسوں کے لیے موسمِ بہار کا درجہ رکھتے ہیں۔ وہ ان کی محبوب ترین غذا ہیں۔ ایسی کسی خبر کو سنتے ہی فوراً ان کے ذہن میں مضامین کا فوارہ ابل پڑتا ہے۔ وہ ان فرقہ وارانہ جھگڑوں کی مبالغہ آمیز کہانیاں بناتے ہیں۔ وہ ان کو انتہائی جذباتی سرخیوں کے ساتھ اپنے اخبار میں شائع کرتے ہیں۔

مجھے یہ کہنے کے لیے معاف کیجئے کہ آج کل کے اردو اخبارات مجھے اتنے زیادہ سطحی معلوم ہوتے ہیں کہ میں کبھی ان کو شوق کے ساتھ نہیں پڑھ پاتا۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ میری سزا کے لیے یہ کافی ہے کہ مجھے کسی ایسے کمرہ میں بند کر دیا جائے جہاں صرف اردو اخبارات ہوں اور مجھ سے کہا جائے کہ تم یہاں رہ کر بس ان اردو اخبارات کو پڑھتے رہو۔ مگر ہمارے اخبار نویسوں کی خوش قسمتی سے عام حالت یہ نہیں ہے۔ ہماری قوم کے بیشتر افراد یا تو جاہل ہیں یا بے شعور۔ قوم کا یہ ذہنی افلاس ان حضرات کی صحافتی فصل کے لیے بہترین مارکٹ کی حیثیت رکھتا ہے۔ چنانچہ بے شعور عوام کی بھیڑ جو باتوں کو گہرائی کے ساتھ سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتی، وہ ان کو خریدتی ہے اور نہایت ذوق وشوق کے ساتھ پڑھتی ہے۔ یہ بلاشبہ ایک سطحی کاروبار ہے اور اسی سطحی کاروبار کا دوسرا نام مسلمانوں کی اردو صحافت ہے۔

ایک اردو اخبار کے مسلمان اڈیٹر جو اب مرحوم ہو چکے ہیں، ان کے متعلق مجھے معلوم ہے کہ وہ ایک جن سنگھی اردو اخبار کے خلاف دھواں دھار اداریے لکھتے تھے۔ اور جن سنگھی اخبار

اس مسلم اخبار کے خلاف مستقل مضامین شائع کرتا تھا۔ ہندو اڈیٹر اور مسلمان اڈیٹر دونوں شام کو ایک ساتھ چائے پیتے اور صبح کے اخبار میں دونوں کے مضامین ایک دوسرے کے خلاف چھپتے۔

اس کا راز یہ ہے کہ دونوں نے اخبار نکالا۔ مگر دونوں کا اخبار کسی طرح چل نہیں رہا تھا۔ آخر انھوں نے آپس میں یہ طے کیا کہ تم ہمارے خلاف لکھو اور ہم تمہارے خلاف لکھیں۔ چنانچہ دونوں نے اس پر عمل شروع کیا اور دونوں کا اخبار دھوم کے ساتھ چل نکلا۔ لوگ روزانہ صبح کو دونوں اخبار خریدتے تاکہ یہ جانیں کہ مسلمان اڈیٹر نے ہندو اڈیٹر کے خلاف کیا لکھا اور ہندو اڈیٹر نے مسلمان اڈیٹر کے خلاف کیا شائع کیا۔

مسلمانوں کے موجودہ اردو اخبارات کے متعلق میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ انھوں نے کسی سے اس قسم کا سمجھوتہ کر رکھا ہے۔ تاہم یہ یقینی ہے کہ ان اڈیٹروں اور فرقہ وارانہ فسادیوں کے درمیان ایک خاموش انڈر سٹینڈنگ ہے ——— تم فساد کرو تاکہ ہم لکھیں۔ تم لکھو تاکہ ہم فساد کریں۔ نصف لی ونصف لك هذا قوم جاهلون۔

راقم الحروف ۱۹۶۷ سے ۱۹۷۴ تک ہفت روزہ الجمعیۃ (دہلی) کا اڈیٹر تھا۔ اسی زمانہ میں مولانا محمد عثمان فارقلیط مرحوم (۱۹۷۵-۱۸۹۷) روزنامہ الجمعیۃ کے اڈیٹر تھے۔ مرحوم کا خاص ذوق "فرقہ پرستوں" سے نوک جھونک کرنا تھا۔ ان کے اداریے اکثر ایسے ہوتے تھے کہ پیشگی طور پر یہ اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ وہ فرقہ وارانہ فساد کے مسئلہ پر پرشور تبصرہ ہوگا۔ ہفت روزہ الجمعیۃ میں میرا انداز، میرے ذوق کے مطابق، اس سے بالکل مختلف تھا۔ ایک بار مرحوم سے اس موضوع پر گفتگو ہو رہی تھی۔ مرحوم نے کسی قدر بگڑ کر کہا:

ہم آپ کی طرح مفکر نہیں، ہم تو جھلی والوں کے لیے لکھتے ہیں

مجھے نہیں معلوم کہ یہ الفاظ مولانا فارقلیط پر کس حد تک صادق آتے ہیں۔ مگر آج کل کے اکثر اردو اخبارات کا حال یقیناً یہی ہے۔ ان کے پست معیار کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ "جھلی والوں" کے لیے نکالے گئے ہیں۔ چنانچہ عملاً بھی یہی ہے کہ وہ صرف عوامی قسم کے لوگوں کے ہاتھ میں نظر آتے ہیں۔ وہ کسی سنجیدہ یا تعلیم یافتہ آدمی کی میز پر کبھی دکھائی نہیں دیتے۔

دہلی کی لیبر کورٹ نے ایک بار اردو اخبار کے مقدمہ کا فیصلہ دیتے ہوئے "کاتب"

کو "جرنلسٹ" شمار کیا تھا۔ اس سے اردو اخبار کے اڈیٹر لوگ بہت ناخوش ہوئے۔ مگر یہ ایک حقیقت تھی جو عدالت کی زبان سے ظاہر ہوئی۔ کسی انگریزی اخبار کے مقدمے میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کمپوزیٹر کو اڈیٹر یا جرنلسٹ کا درجہ دیا جائے۔ مگر اردو اخبار کا معیار خود ہی ایسا ہے کہ اکثر اس میں کاتب اور اڈیٹر کا فرق بہت کم ہوتا ہے ——— یہی وہ مقام ہے جہاں اردو صحافت کا حقیقی المیہ چھپا ہوا ہے۔

بمبئی میں وہاں کے ریڈیو اسٹیشن نے میری ایک تقریر ریکارڈ کی جو بعد کی کسی تاریخ کو نشر کی گئی۔ تقریر کا عنوان انھوں نے اپنی طرف سے حسب ذیل تجویز کیا تھا:

اسلام کے آفاقی اصول

اس پروگرام کی اطلاع جناب نسیم علی خاں صاحب نے بذریعہ ٹیلی فون پیشگی طور پر مجھے دیدی تھی۔ چنانچہ روانگی سے قبل دہلی میں میں نے مذکورہ موضوع پر تقریباً پندرہ منٹ کی ایک تقریر تیار کرلی تھی۔ یہ تقریر ۲۲ اگست کو دوپہر کے وقفہ کے وقت ریڈیو اسٹیشن کے اسٹوڈیو میں ریکارڈ کی گئی۔ انشاء اللہ آئندہ یہ تقریر الرسالہ میں شائع کردی جائے گی۔

بمبئی کی یادوں میں سے ایک یاد ایک ٹیکسی ڈرائیور ہے۔ ایک بار ہم ایک ٹیکسی پر سفر کررہے تھے۔ مجھے ڈرائیور کے چہرے پر داڑھی دیکھ کر اس سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ اس کا نام ہیرالال ہے۔ میں نے اس سے اس کے پیشہ کے بارہ میں کئی سوالات کئے۔ اس نے بتایا کہ ایک عام آدمی اگر ایک فیٹ کار خریدے تو اس کو وہ ایک لاکھ میں پڑے گی۔ مگر ہم لوگوں کو وہ رعایتی طور پر ۸۵ ہزار میں مل جاتی ہے۔

ہیرالال اپنی ٹیکسی کا خود مالک ہے۔ میں نے پوچھا کہ گاڑی کی قیمت آپ لوگ کتنے دن میں نکال لیتے ہیں۔ اس نے کہا کہ دو سال میں۔ اس نے بتایا کہ ہم لوگ دو بھائی ہیں۔ دونوں مل کر رات کو بھی چلاتے ہیں اور دن کو بھی۔ ہم نے پہلے ایک گاڑی خریدی تھی۔ اب ہمارے پاس تین گاڑیاں ہیں۔

میں نے کہا کہ گاڑی کے لیے سب سے بڑا مسئلہ ایکسیڈنٹ کا ہوتا ہے۔ ایکسیڈنٹ سارے نفع کو کھا جاتا ہے۔ پھر ایکسیڈنٹ سے آپ کس طرح اپنے آپ کو بچاتے ہیں۔ اس کے جواب

میں اس نے جو کچھ کہا وہ ایک ایسا کلمۂ حکمت تھا جو موجودہ زمانہ کے کسی بھی مفکر اسلام یا حکیم امت کے یہاں مجھ کو سننے یا پڑھنے کو نہیں ملا۔ اس کے الفاظ یہ تھے :

ہم کو دوسروں کی غلطی کو سنبھالنا پڑتا ہے

اس نے کہا کہ سڑک پر گاڑیاں چلانے والے اکثر اناڑی پن کے ساتھ گاڑیاں چلاتے ہیں۔ وہ غلط طریقہ سے اپنی گاڑی دوڑاتے ہیں۔ اگر ہم بھی انھیں کی طرح کرنے لگیں تو ایکسیڈنٹ یقینی ہے۔ اس لیے جو کام دوسروں کو کرنا چاہیئے وہ ہمیں کرنا پڑتا ہے۔ ہم کو یہ کرنا پڑتا ہے کہ دوسرا شخص جب غلطی کرے تو ہم اپنے آپ کو اس کی غلطی سے بچائیں۔

سڑک پر گاڑی دوڑانے والا آدمی اگر یہ بحث چھیڑے کہ کون صحیح ہے اور کون غلط، تو وہ خود غلط ہو کر رہ جائے گا۔ چنانچہ وہ قانونی اور منطقی نقطۂ نظر کو چھوڑ کر عملی نقطۂ نظر اختیار کرتا ہے۔ وہ اس بحث میں نہیں پڑتا کہ غلطی کس کی ہے۔ وہ صرف یہ سوچتا ہے کہ میں اپنے آپ کو اس کی غلطی کی انجام سے کس طرح بچاؤں۔ دوسرا اگر غلطی کر رہا ہو تب بھی وہ اس غلطی کو اپنے خانہ میں ڈال لیتا ہے۔ وہ دوسرے کی غلطی کو یک طرفہ طور پر خود درست کرتا ہے۔ یہی وہ چیز ہے جس کو قرآن میں اعراض کہا گیا ہے۔

ڈرائیور سے گفتگو کے بعد میں نے سوچا کہ ہیرالال نے جو بات سڑک کے بارہ میں بتائی، وہی بات عام زندگی کے بارہ میں بھی صحیح ہے۔ لوگوں کے درمیان رہتے ہوئے بھی ہمیں وہی کرنا ہے جو ایک ٹیکسی ڈرائیور بھری ہوئی سڑک پر چلتے ہوئے کرتا ہے۔ یعنی دوسرے لوگ جب غلطی کریں تو ہم ان کی غلطی کو سنبھالیں۔ دوسروں کی غلطی کے انجام سے اپنے آپ کو بچانے کی تدبیر کریں۔ مگر حیرت ہے کہ ہمارے لیڈر جو قوم کے ڈرائیور ہیں، وہ اس سادہ سی حقیقت کو نہیں جانتے۔ جو ٹیکسی کا معمولی ڈرائیور بھی جانتا ہے۔ شاید اس لیے کہ قوم کے لیڈر قوم کے بارہ میں اتنے سنجیدہ نہیں جتنا ایک ٹیکسی ڈرائیور اپنی ٹیکسی کے بارہ میں سنجیدہ ہوتا ہے۔ ٹیکسی ڈرائیور کو اپنی ٹیکسی کا درد ہے، یہ درد اس کو بتائے بغیر وہ بات سمجھا دیتا ہے جو درد سے خالی آدمی بتانے کے بعد بھی نہیں سمجھتا۔

کچھ علوم وہ ہیں جو درد کی درس گاہ میں پڑھائے جاتے ہیں۔ اگر آپ درد کی درس گاہ

کے طالب علم نہ ہوں تو آپ ان علوم کو سمجھ بھی نہیں سکتے۔

حسب پروگرام کانفرنس کے آخر میں میری دوسری تقریر ہوئی۔ یہ تقریر تقریباً ایک گھنٹہ تک جاری رہی۔ میں نے اپنی تقریر کا آغاز ان الفاظ سے کیا ——— حقیقتِ واقعہ سے مطابقت کا نام کامیابی ہے اور حقیقتِ واقعہ سے مطابقت نہ کرنے کا نام ناکامی :

What is success? To live in accordance with realities.
What is failure? To defy them.

قرآن وحدیث سے اور مختلف مثالوں سے تشریح کرتے ہوئے میں نے بتایا کہ خدا نے اس دنیا کو اس ڈھنگ پر بنایا ہے کہ یہاں ایک اور دوسرے کے درمیان مقابلہ اور مسابقت پیش آئے۔ پھر کوئی جیتے اور کوئی ہارے۔ کوئی غالب ہو اور کوئی مغلوب رہے۔ یہ زندگی کی ایک حقیقت ہے اور یہ تخلیق الٰہی کے عین مطابق ہے۔ اس لیے وہ بہر حال باقی رہے گی۔ یہاں تک کہ قیامت آجائے۔ ہمیں چاہیے کہ شکایت اور احتجاج کا طریقہ چھوڑ کر حکیمانہ تدبیر اور تعمیری استحکام کے ذریعہ اپنے مسائل کو حل کریں۔ یہ تقریر انشاء اللہ مرتب کرکے شائع کر دی جائے گی۔

بمبئی میں لوگوں کا اصرار تھا کہ میں مزید قیام کروں۔ مگر میرے لیے مزید ٹھہرنے کا موقع نہیں تھا۔ اس لیے معذرت کرکے ۲۴ اگست ۱۹۸۶ کی صبح کو میں دہلی واپس آگیا۔

قیمت میں اضافہ

سابقہ اعلان کے مطابق الرسالہ اردو اور انگریزی کی قیمت میں جنوری ۱۹۸۷ سے اضافہ کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ جنوری ۱۹۸۷ سے الرسالہ کی قیمتیں حسب ذیل ہوں گی۔

فی شمارہ — چار روپیہ

سالانہ — ۴۸ روپیہ

اسی نسبت سے ایجنسی کی قیمتوں میں بھی اضافہ ہو جائے گا۔

۱۔ اردو کے علاوہ دوسری زبانوں میں بھی الرسالہ کے مضامین کثرت سے نقل کیے جارہے ہیں۔ مثلاً دہلی کے سہ ماہی انگریزی مجلّہ (Amity and Solidarity) نے اپنی اشاعت جون ۱۹۸۶ میں صفحہ ۳۷ پر الرسالہ کا ایک مضمون نمایاں طور پر شائع کیا ہے۔ اس کا عنوان ہے :

An incident from the life of Umar Faruq, the Second Caliph.

۲۔ بمبئی کا انگریزی ویکلی (Clarity) اکثر الرسالہ کے مضامین نقل کرتا ہے۔ مثلاً اس کی اشاعت ۲۰ جولائی ۱۹۸۶ صفحہ ۶ پر الرسالہ کا ایک مضمون حوالہ کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔

۳۔ بمبئی کے انگریزی ہفتہ وار (Clarity) کے اڈیٹر مسٹر کوپلے ۲۰ جولائی ۱۹۸۶ کو مرکز میں آئے اور اپنے اخبار کے لیے صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ انٹرویو کا خاص مقصد ملکی حالات کے بارہ میں صدر اسلامی مرکز کے خیالات کو ریکارڈ کرنا تھا۔ یہ انٹرویو کلیرٹی ۱۰ اگست ۱۹۸۶ میں شائع ہو چکا ہے۔

۴۔ ایک صاحب کان پور سے اپنے خط (۲ جولائی ۱۹۸۶) میں لکھتے ہیں: الرسالہ کیا ہے، ایک تازیانہ ہے جس کو پڑھنے کے بعد ذہن فوراً آخرت کے احوال کی طرف منتقل ہو کر قلب میں ایک کیفیت پیدا ہوتی ہے جو بیان سے باہر ہے۔ قلب متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اللہ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ آپ کا سایہ دیر تک باقی رکھے تاکہ امت مسلمہ کے لیے خصوصاً اور پوری انسانیت کے لیے عموماً تا دیر مستفید ہونے کا موقع ملے۔ (محمد اجمل لاری)

۵۔ الرسالہ انگریزی خدا کے فضل سے دن بدن اپنی مقبولیت بڑھا رہا ہے۔ ہر طبقہ کے لوگوں کے خطوط ہم کو موصول ہوتے رہتے ہیں۔ مثلاً ایک خط کا مضمون حسب ذیل ہے :

I am getting the *'Al-Risala'* monthly regularly, thanks to the kind gift of Mrs. T.R. Sherwani. It is a wonderful publication, bringing before us the universal truths in simple easily understandable language. It opens windows of inspiration. I request each reader to gift this publication to at least one friend, so that the *message* in *'Al-Risala'* can spread yet further. I therefore, enclose Rs. 36/- by draft and request you to enrol Shri Ak Shobh Singh, Kashipur House, Ayarpata, Nainital 263001 as a subscriber. Thanks, yours faithfully,

Dr (Mrs) Kanak Bhargava MBBS, Ellesmere, Nainital

۶۔ الرسالہ انگریزی کے سلسلہ میں جناب بدرالدین طیب جی کا ایک خط موصول ہوا ہے۔ موصوف نے اپنے اس خط میں اس کے زبان وبیان دونوں کے بارہ میں اپنے گہرے تاثر کا اظہار کیا ہے۔ خط کا اصل مضمون حسب ذیل ہے :

Just a line to thank you for sending me *Al-Risala* so regularly. For one reason or the other I am the recipient of a large number of publications; and cannot really digest them along with my general reading. So I have not been able to pay much attention to *Al-Risala* so far; but I had some time today, and read your July No 30 issue through. I was impressed by its tone and contents and its clear and unostentatious style of writing. Thank you. With kind regards,

Badruddin Tayabji
1/23, Shantiniketan, New Delhi 110021

۷۔ پٹنہ میں ایک اجتماع (۱۲-۱۳ جولائی ۱۹۸۶) ہوا۔ اس میں صدر اسلامی مرکز نے شرکت کی۔ اس کی تفصیلی روداد انشاء اللہ الرسالہ میں شائع کر دی جائے گی۔

۸۔ مہاراشٹر اسٹیٹ بیورو آف ٹیکسٹ بکس نے ساتویں جماعت کے لیے "اردو بال بھارتی" نام سے ۱۶۶ صفحات کی درسی کتاب شائع کی ہے۔ اس کے صفحہ ۱۸-۲۳ پر صدر اسلامی مرکز کا ایک سفرنامہ (ملیشیا) الرسالہ سے لے کر شائع کیا گیا ہے۔

۹۔ فرینک فرٹ میں یکم اکتوبر سے ۶ اکتوبر ۱۹۸۶ تک کتابوں کی نمائش (Book Fair) ہوئی۔ اس سلسلہ میں نمائش کے ایک ذمہ دار سلویا کرشس (Silvia Kirsch) نے ایک خط کے ذریعہ اطلاع دی ہے کہ اسلامی مرکز کی کتابیں بھی اس موقع پر بطور نمائش رکھی گئی ہیں جس اسٹال پر یہ کتابیں رکھی گئی ہیں اس کا نام ہے :

Special Exhibition– Printed and Published in India

۱۰۔ نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا کی طرف سے سرینگر میں کتابوں کی ایک نمائش ۴ اگست سے ۱۴ اگست ۱۹۸۶ تک منعقد کی گئی۔ اس موقع پر اسلامی مرکز اور مکتبہ الرسالہ کی طرف سے ایک بک اسٹال لگایا گیا۔ تجربہ خدا کے فضل سے کافی کامیاب رہا۔

۱۱۔ الرسالہ اردو اور مطبوعات الرسالہ کے سلسلہ میں ملک کے اندر اور ملک کے باہر سے مستقل خطوط موصول ہوتے رہتے ہیں۔ ایک خط یہاں نقل کیا جاتا ہے : "احوال یہ ہے کہ میں نے

پاکستان میں فضلی سنز والوں اور محمد موسیٰ صاحب کی طرف سے چھاپے گیے آپ کی کتب کا مطالعہ کیا۔ بس مطالعہ کیا کیا، کتابیں پڑھنے کے بعد میں دیوانہ ہوگیا ہوں۔ میں نے اس سے پہلے بھی کئی علماء کی لکھی ہوئی کتابوں کا مطالعہ کیا ہے لیکن جو بات آپ کے لٹریچر پڑھنے کے بعد دل میں پیدا ہوئی ہے اور روشنی نمودار ہوئی ہے وہ مجھے کہیں اور نہیں ملی۔ آپ کی تحریروں نے میری نیند حرام کر دی ہے اب میں نے آپ کے پاکستان میں موجود تمام کتب خرید کر پڑھ لیے ہیں۔ خاص طور پر الرسالہ اردو کبھی کبھی حافظ موسیٰ صاحب سے لے کر پڑھتا ہوں۔ ابھی انگریزی میں الرسالہ کی ایک کاپی حیدر آباد سندھ سے محترم عبدالہادی صاحب سے حاصل کی اور ایک دم اسے پڑھ لیا۔ بس افسوس اس بات کا ہوا کہ آپ جیسے عظیم آدمی سے تعارف اتنی دیر سے کیوں ہوا۔ کاش آپ پاکستان میں ہوتے ——— کاش ہم آپ سے پہلے واقف ہوتے۔ سچ پوچھیں تو اب تک ہم قومی اسلام سے وابستہ تھے۔ آپ کی تحریروں کے پڑھنے سے ہم خدا کے دین اسلام سے وابستہ ہوگیے ہیں۔ میری ایک گذارش ہے کہ الرسالہ انگریزی کے اور اردو کے پورے سال کے پرانے سیٹ اگر آپ کے پاس ہوں تو برائے مہربانی میں خریدنا چاہتا ہوں اس کے لیے آپ مجھے طریقہ کار بتا دیں۔ اور انگریزی میں قرآن کی تفسیر اگر تیار ہوگئی ہو تو وہ بھی مجھے خریدنی ہے۔"

Agha Noor Mohammad Pathan, C-163, Block 10, F.B. Area, Karachi

۱۲۔ الرسالہ کے ایک قاری لکھتے ہیں: الرسالہ میں پابندی سے پڑھتا ہوں اور پڑھاتا ہوں۔ اگر میں نے الرسالہ نہ پڑھا ہوتا تو میں بھی کسی نہ کسی طور پر گم راہی میں مبتلا رہتا۔ حتی کہ یہ بھی نہ سمجھ پاتا کہ شرک کیا ہے۔ الرسالہ ہندی میں نہیں ہے۔ اس لیے چند ہندوؤں کو اردو الرسالہ پڑھ کر سنایا کرتا ہوں۔ جن سے میری دوستی ہے۔ وہ لوگ بہت پسند کرتے ہیں اور تڑپتے ہیں کہ کاش وہ ہندی میں ہوتا۔ ہندوؤں کے کانوں نے کبھی ایسی اسلامی دعوت کو نہیں سنا ہے جس میں ان کے لیے نفرت کے علاوہ اور کچھ ہو، اس لیے ان کو زیادہ دل چسپی ہے جو زیادہ پڑھے لکھے ہیں۔ ممکن ہے کہ آئندہ اللہ تعالیٰ انھیں لوگوں سے اپنے دین کا کام لے (۱۳ جون ۱۹۸۶)

تعمیرِ ملّت

مکان بنانے کا کام بنیاد سے شروع ہوتا ہے

اور

قوم بنانے کا کام شعور بنانے سے۔

ماہنامہ الرسالہ قوم کی تعمیر کا یہی بنیادی کام کر رہا ہے۔

وہ افرادِ قوم کا شعور بنانے میں مصروف ہے۔

اس مہم میں ساتھ دینا ایک تاریخ ساز مہم میں ساتھ دینا ہے۔

الرسالہ کو پڑھیے

الرسالہ کو پڑھائیے

اس وقت یہی سب سے بڑا کام ہے جس میں آپ کو لگنا چاہیے۔

یہی آج کی سب سے بڑی مہم ہے جس میں آپ کو ساتھ دینا چاہیے۔

قوم کی تعمیر میں اپنا حصہ ادا کیجئے

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کار نبوت ہے اور ملت کے اوپر خدا کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور صاحب ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

۴۔ صاحب استطاعت افراد کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ ایک سال یا چھ ماہ کی مجموعی رقم پیشگی روانہ کردیں اور الرسالہ کی مطلوبہ تعداد ہر ماہ ان کو سادہ ڈاک سے یا رجسٹری سے بھیجی جاتی رہے۔ ختم مدت پر وہ دوبارہ اسی طرح پیشگی رقم بھیج دیں۔

۵۔ ہر ایجنسی کا ایک حوالہ نمبر ہوتا ہے۔ خط و کتابت یا منی آرڈر کی روانگی کے وقت یہ نمبر ضرور درج کیا جائے۔

زر تعاون الرسالہ

زر تعاون سالانہ	۳۶ روپیہ
خصوصی تعاون سالانہ	۲۰۰ روپیہ

بیرونی ممالک سے

ہوائی ڈاک	۲۰ ڈالر امریکی
بحری ڈاک	۱۰ ڈالر امریکی

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسئول نجے کے آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی - ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا

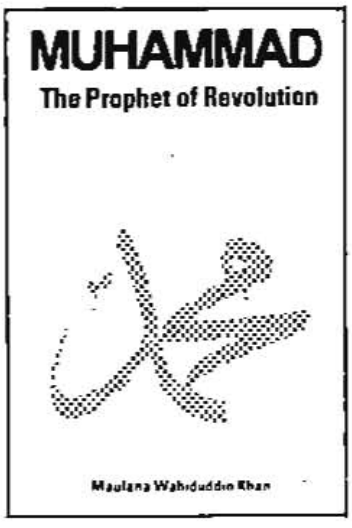

MUHAMMAD

The Prophet of Revolution

By

Maulana Wahiduddin Khan

In making the Prophet Muhammad the greatest figure, and consequently one of the most resplendent landmarks in human history, God has bestowed his greatest favour on mankind. Whoever seeks guidance cannot fail to see him, for he stands out like a tower, a mountain on the horizon, radiating light like a beacon, beckoning all to the true path. It is inevitable that the seekers of truth will be drawn up to the magnificent pinnacle on which he stands.

ISBN 81-85063-00-1 (PB Rs 50 $ 5)
ISBN 81-85063-07-9 (HB Rs 90 $ 9)

Maktaba Al-Risala
C-29 Nizamuddin West New Delhi - 110013

Regd. No. D(SE) 243
Regd. R.N. No. 28822/76

October 1986
Number 119

GIFTING The Word of God

To spread the word of God is the highest form of charity. It appeals to the mind, the heart, the soul, that being the earnest endeavour of this magazine, how noble-spirited it would be of you, dear readers, if you sent it on regularly to friends and relatives. Make a **GIFT** of it. Think of a whole year's subscription as being both a delightful present as well as a contribution to a worthy cause.

Please send AL-RISALA to my friend/ relative to the following address:

Name .....

Address .....

.....

.....

I am enclosing cheque/Postal Order/ Bank Draft/M.O. Receipt No. .....

Please tick box where applicable

☐ URDU
☐ ENGLISH
☐ ONE YEAR
☐ TWO YEARS

SUBSCRIPTION RATES:
(Prices include postage)

INLAND	Rs. 36
ABROAD	
By air-mail	$ 20
By surface mail	$ 10

Please send this together with the payment to the Circulation Manager
ALRISALA C-29 Nizamuddin West New Delhi 110 013

Rs. 3.00